نام کتاب ——— عیدالاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی

بار اوّل تا بار ہشتم (ستمبر 1983ء تا اکتوبر 2007ء) ——— 23,700

بار نہم (اکتوبر 2010ء) ——— 2200

ناشر ——— ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 35869501-3

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت (اشاعت خاص) ——— 35 روپے

(اشاعت عام) ——— 20 روپے

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

عنوانات

عید الاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی	5
حیاتِ دُنیوی کا قرآنی فلسفہ	7
حیاتِ ابراہیمی : امتحان و آزمائش کی مثالِ کامل	10
* فکر و نظر کا امتحان	11
* قوّتِ ارادی کی آزمائش	14
* بت شکنی کا اقدام	15
* حاکم وقت سے مباحثہ	18
* بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق	20
* ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت اِلی اللہ	23
* اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام کی ولادت	25
* امتحان و آزمائش کا نقطۂ عروج	27
ذبح عظیم	31
فریضۂ حج اور حیاتِ ابراہیمیؑ کے مراحل	34
عید الاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی	36
* قربانی کی اصل رُوح	40
حج اور عید الاضحیٰ اور ان کی اصل رُوح : قرآن حکیم کے آئینے میں	43

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے مسجد دار السلام باغ جناح لاہور میں ذوالحجہ ۱۴۰۲ھ کے پہلے جمعہ میں "عید الاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی" کے موضوع پر ایک جامع اور مبسوط تقریر فرمائی تھی۔ یہ تقریر ماہنامہ "میثاق" کی اشاعت بابت ماہ ذوالحجہ ۱۴۰۲ھ (۱۹۸۲ء) میں شائع کی گئی اور پھر ۱۹۸۳ء میں اسے افادۂ عام کے پیش نظر کتابی صورت میں شائع کیا گیا ـــــ مزید برآں اس کے ساتھ محترم ڈاکٹر صاحب کی ایک جامع تحریر بعنوان "حج اور عید الاضحیٰ اور ان کی اصل روح' قرآن حکیم کے آئینے میں" بھی شامل اشاعت کی دی گئی تھی۔

حال ہی میں اس کے نئے ایڈیشن کی تیاری کے طور پر اس کی کمپیوٹر کتابت کرائی گئی ہے۔ جس سے اس کتابچے کے حسن ظاہری میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کتابچے کے مطالعے سے جہاں ان شاء اللہ تعالیٰ عید الاضحیٰ اور قربانی میں جو ربط و تعلق ہے وہ قارئین کے سامنے آئے گا' وہیں وہ مغالطے بھی اگر اللہ نے چاہا تو دور ہو جائیں گے جو حج کے موقع پر منیٰ کے علاوہ دوسری جگہوں پر قربانی کی مخالفت میں منکرین حدیث کی جانب سے دیئے جاتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم میں وہ طلب پیدا ہو کہ ہم عقل و شعور کے ساتھ یہ معلوم کر سکیں کہ اصل "روحِ قربانی" کیا ہے! پھر اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں توفیق دے کہ ہم اس کو اپنی شخصیت میں جذب کر سکیں اور صرف ہماری زبان قال ہی سے نہیں بلکہ زبان حال سے بھی اس حقیقت کی جھلک نظر آئے کہ :

﴿ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ ﴾

ناظم مکتبہ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی علٰی رَسُولِہِ الکریم

خطبہ مسنونہ، تلاوتِ آیات اور ادعیہ ماثورہ کے بعد فرمایا :

حضراتِ گرامی!

اسلام میں عیدیں دو ہی ہیں، عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ عید الاضحیٰ کی نمایاں ترین اور امتیازی شان قربانی ہے۔ اس قربانی کا فلسفہ کیا ہے اور یہ کس چیز کی علامت ہے؟ یہ وہ بات ہے جو خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کی تھی۔ اس لئے کہ قرآن مجید نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں یہ روح بیدار کردی تھی کہ وہ احکامِ ربانی کی علّتیں، مصلحتیں اور حکمتیں جاننے کی کوشش کریں۔ قرآن مجید کا عمومی انداز یہی ہے کہ وہ جو حکم دیتا ہے تو اس کی علت و حکمت بھی بیان کردیتا ہے۔ چنانچہ نماز کی حکمت یوں بیان کی گئی ہے کہ : ﴿ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ﴾ "نماز قائم کرو میری یاد کے لئے"۔ یعنی یہ صرف ایک رسم (ritual) نہیں ہے، اس کا ایک متعیّن مقصد ہے —— روزہ رکھنے کا حکم دیا تو ساتھ ہی اس کی حکمت بھی بتادی کہ ﴿ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ "تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہوجائے"۔ واضح کردیا گیا کہ روزے کی یہ عبادت بھی محض ایک رسم نہیں ہے، بلکہ اس کا بھی ایک معین مقصد ہے اور اس کی بھی ایک حکمت ہے۔ لہٰذا قربانی کی حکمت معلوم کرنے کے لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ : مَاھٰذِہِ الْاَضَاحِیُّ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ "اے اللہ کے رسولؐ! ان قربانیوں کی کیا حقیقت ہے؟"

دیکھئے، اس سوال کے انداز میں بھی ایک بہت پیارا نکتہ ہے۔ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عرض کررہے ہیں کہ قربانی تو ہم دیتے ہی ہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حکم پر عمل کرنے کا دارومدار حکمت و علّت اور مقصد کے جاننے یا سمجھ لینے پر نہیں ہے، حکم پر عمل تو اصلاً اس لئے ہوگا کہ وہ حکم اللہ یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ البتہ اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اس کی

حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ ہر حکم پر غور و تدبر کرو اور احکام کی علتیں اور حکمتیں سمجھنے اور دریافت کرنے کی کوشش کرو۔ ہمارے ہاں فقہ میں اجتہاد اور قیاس کا جو معاملہ ہے اس کا دارومدار احکام کی علت و حکمت کی دریافت پر ہی ہے۔ کسی حکم کے بارے میں غور و تدبر کرنا اور یہ سمجھنے کی کوشش کرنا کہ اس کا کیا سبب و علت ہے؟ اس کی کیا حکمت ہے؟ اس کا کیا مقصد ہے؟ ہمارے دین نے اس کی حوصلہ شکنی کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اسی سے ہمت پا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم جو آپؐ کے حکم پر عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی دیتے ہیں تو ہمیں یہ بتائیے کہ یہ ہے کیا؟ یعنی اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس کا پس منظر کیا ہے؟ یہ کس چیز کے لئے بطورِ علامت ہے؟ تو نبی اکرم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ : ((سُنَّةُ اَبِيكُمْ اِبْرٰهِمَ))[1] "یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سُنّت ہے"۔ گویا کہ یہ اس عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہے جس میں ایک سو سالہ بوڑھے باپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے اکلوتے بیٹے کے گلے پر، جو نوجوانی کے دور میں قدم رکھ رہا ہے، چھری پھیر دی تھی۔ جو گویا کہ اللہ کی راہ میں قربانی کی آخری صورت ہو سکتی ہے کہ اپنی محبّت، اپنے جذبات اور اپنے احساسات کو اللہ کی رضا جوئی کے لئے قربان کر دیا جائے۔

یہ وہ واقعہ ہے جو اس لحاظ سے نوعِ انسانی کی تاریخ کی ایک عظیم علامت (symbol) بن گیا ہے اور اس طرح یہ قربانی ہمیشہ کے لئے شعائرِ دین میں شامل ہو گئی ہے۔ یہ اس قربانی کی روح کو بیدار اور برقرار رکھنے کا بھی ایک اہم ذریعہ بن گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو ایک بندۂ مؤمن سے مطلوب ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں اپنی محبوب ترین چیز بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہو۔ چنانچہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس قربانی کی یاد ہے جو ہر سال منائی جاتی ہے۔

---

(1) مسند احمد ۳۶۸/۴۔ سنن ابن ماجه (ح ۳۱۲۷) كتابُ الاضاحی، باب ثواب الاضحية

حیاتِ دُنیوی کا قرآنی فلسفہ

اب میں چاہوں گا کہ آپ کو بتاؤں کہ اصل میں یہ قربانی حضرت ابراہیم (علیٰ نبینا وعلیہ الصّلوٰۃ والسلام) کی زندگی میں کس اہمیت کی حامل ہے اور ان کی قربانیوں کا وہ کون سا سلسلہ ہے جس کا آخری نقطہ عروج (Climax) یہ واقعہ ہے۔ حیاتِ دُنیوی کے سلسلے کا جو فلسفہ قرآن بیان کرتا ہے وہ سورۃ الملک کی دوسری آیت میں بڑی جامعیت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے —— میں نے یہاں خاص طور پر "حیاتِ دُنیوی کا فلسفہ" کے الفاظ ادا کئے ہیں، کیونکہ ہمارے دین کے نزدیک کُل حیات یہ نہیں ہے۔ حیاتِ انسانی بہت طویل ہے۔ بقولِ علامہ اقبال مرحوم ؎

تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی!

لیکن یہ جو موت ہے اس کے ذریعہ سے حیاتِ انسانی کے طویل سلسلے کا ایک انتہائی قلیل ٹکڑا کاٹ لیا گیا ہے۔ یہ جو ٹکڑا کٹ گیا ہے، یعنی موت سے پہلے کی زندگی، تو اس حصے کو انسان دنیا میں بسر کر رہا ہے۔ اب سوچنا ہوگا کہ انسان کی اس دُنیوی زندگی کی غرض وغایت کیا ہے! فرمایا:

﴿ اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾

"وہ جس نے موت و حیات کا یہ سلسلہ اس لئے تخلیق فرمایا کہ (اس کے ذریعے) تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔"

یہ اس غرض وغایت کا بیان ہے۔ "ب ل و" مادہ عربی زبان میں جانچنے اور پرکھنے کے مفہوم میں آتا ہے۔ اسی سے باب افتعال میں لفظ "ابتلاء" ہے۔ اسی سے لفظ "بلوئ" بنا ہے۔ اس ابتلاء کے ذریعے خوف کی حالت میں انسان کی ہمت، اس کے ثبات، اس کی عزیمت اور اس کے صبر کی آزمائش ہوتی ہے۔ یہ لفظ سورۃ الصافات کی ان آیات میں بھی آیا ہے جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم قربانی کا ذکر ہوا ہے۔ فرمایا: ﴿ اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ۝ ﴾ "(اے ابراہیم علیہ السلام) یقیناً یہ ایک

بہت ہی نمایاں، واضح، کھلی اور کٹھن آزمائش تھی"۔

پس معلوم ہوا کہ خالقِ کائنات کی طرف سے موت و حیات کا یہ نظام ابتلاء، آزمائش، امتحان اور جانچنے اور پرکھنے کے لئے تخلیق فرمایا گیا ہے۔ ساتھ ہی اسی آیت میں اس جانچ اور پرکھ کی غایت بھی بیان کر دی گئی کہ ﴿ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ﴾ یعنی وہ (اللہ تعالیٰ) یہ دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔ تم جو اس دنیا میں اپنے خالق کی ذات سے محجوب کر دیئے گئے ہو اور اصل حقائق تمہاری نگاہوں سے اوجھل کر دیئے گئے ہیں۔ حقیقت الحقائق ذاتِ باری تعالیٰ ہے ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ ﴾ الحق اللہ کی ذات ہے اور وہ آنکھوں سے اوجھل ہے۔ اب تمہاری آزمائش اور تمہارا امتحان اس میں ہے کہ ہم نے تم کو جو استعدادات دی ہیں، عقل، نظر اور تفکر و تدبّر کی جو صلاحیتیں عطا کی ہیں، جو بصیرتِ باطنی عنایت کی ہے، تو ایک تو ان کے ذریعے ہم کو پہچانو۔ ان آنکھوں سے دیکھے بغیر دل کی آنکھوں سے ہمیں دیکھو اور ہماری معرفت حاصل کرو —— پہلی آزمائش یہ ہے۔ یہ تو گویا نظری، فکری، عقلی اور علمی آزمائش ہے کہ آیا تم حجابات ہی سے محجوب ہو کر رہ جاتے ہو، پردوں ہی کے نقش و نگار دیکھنے میں محو ہو جاتے ہو، یہیں کی ظاہری آرائش و زیبائش تمہیں مبہوت کر دیتی ہے اور تم اسی کے اندر گم ہو کر رہ جاتے ہو، جس کو علامہ اقبال مرحوم نے یوں تعبیر کیا ہے کہ ع "کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے" ہم نے تمہیں پردوں میں رکھا ہے۔ پھر پردے بھی بڑے خوش نما ہیں۔ اس زمین میں جو کچھ ہے اس کو ہم نے اس کی زینت کے لئے بنایا ہے۔ ﴿ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا ﴾ گویا اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ دراصل اس زمین کی زیبائش و آرائش اور سنگھار ہے۔ اس میں بھی ایک آزمائش ہے، ابتلاء ہے، امتحان ہے۔ تو پہلی آزمائش عقل اور فکر و نظر کی آزمائش ہے۔ انسانی کی جو قوتِ نظری ہے اس کا امتحان ہے کہ یہ انسان اپنے رب، مالک اور خالق کو پہچانتا ہے یا نہیں —— جبکہ دوسری آزمائش انسان کے ارادے، عمل اور سیرت و کردار کی پختگی سے متعلق ہے۔

اب اگر اپنے مالک و خالق حقیقی کو پہچان لیا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہئے کہ انسان اسی سے دل لگائے، اسی سے لَو لگائے، اسی کو مطلوب و مقصود بنائے، اس کی عبادت و اطاعت کرے۔ اب قدم قدم پر امتحانات آئیں گے۔ دنیا کی چیزیں انسان کو اپنی طرف کھینچیں گی۔ بقولِ شاعر ؎ "اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے!" وہ ان آرائشوں اور زیبائشوں کی طرف توجہ کرتا ہے یا ہماری طرف متوجّہ ہوتا ہے۔ ان کو مطلوب و مقصود سمجھتا ہے یا ہمیں مطلوب و مقصود بناتا ہے۔ اگر اس کے سامنے یہ متبادل (alternative) راستے رکھ دیئے جائیں کہ یا اللہ کے راستے کو چھوڑو یا اپنے عزیزوں کو چھوڑو، وطن کو خیرباد کہہ دو، تو دیکھیں وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ وطن اور اپنے اعزّہ و اقارب کے حق میں فیصلہ کرتا ہے یا اللہ کے حق میں فیصلہ کرتا ہے! اگر اس کے سامنے یہ دوراہا آجاتا ہے کہ یا والدین کو چھوڑے یا اللہ کی توحید کو چھوڑے، تو دیکھیں کہ کس کو چھوڑتا ہے! اگر اس کے سامنے یہ معاملہ آجائے کہ اپنی زندگی کی قربانی قبول کرے یا اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کا رشتہ توڑ دے اور معبودانِ باطل کی پرستش کرنے لگے، تو دیکھیں کہ اس کے بارے میں اس کا فیصلہ کیا ہوتا ہے؟ —— اور اگر اس کے سامنے یہ مرحلہ آجائے کہ دنیا کی جو محبوب ترین شے ہو سکتی ہے اس کی محبّت اور اللہ کی محبّت کے درمیان فیصلہ کرنے کو کہا جائے تو دیکھیں وہ کدھر کا رُخ کرتا ہے ؎

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے!

یہ کُل امتحان ہے —— جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ پہلا امتحان عقل و فکر کا امتحان ہے۔

دوسرا امتحان ارادے، نیت، سیرت و کردار اور عمل کا امتحان ہے۔ تو یہ ہے امتحان اور یہ ہے زندگی کی اصل غرض و غایت ﴿ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ ﴾ —— اس کی ترجمانی بھی علامہ اقبال مرحوم نے بڑی

خوبصورتی سے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانند حباب!
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

یہ جو ہماری زندگی ہے یہ حباب کی مانند ہے 'بڑی عارضی' بڑی فانی 'پانی کا بلبلہ' جو اَب پھٹا کہ اب پھٹا۔ بلبلے کی اس سے زیادہ اور کیا حیثیت ہے۔ اس حیاتِ دُنیوی کی پائیداری پر کوئی اعتماد نہیں ہو سکتا کہ یہ کب تک رہے گی۔ لیکن جتنی دیر بھی یہ بلبلہ قائم رہے اس کی بھی ایک غرض و غایت ہے۔ وہ بھی عبث نہیں ہے۔ ذرا اس کائنات کی وسعتوں کا تصور کیجئے 'جس کو علامہ مرحوم نے اس شعر میں قلزم سے تعبیر کیا ہے۔ پس یہ زندگی ایک آزمائش اور امتحان سے زیادہ کوئی حیثیت اور وقعت نہیں رکھتی

یہ گھڑی محشر کی ہے تُو عرصہ، محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

حیاتِ ابراہیمیؑ : امتحان و آزمائش کی مثالِ کامل

اس امتحان کی جو کامل و مکمل مثال قرآن مجید پیش کرتا ہے وہ حضرت ابراہیم (علیٰ نبینا وعلیہ السلام) کی زندگی ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۲۴ کا آغاز ان الفاظ میں ہوتا ہے : ﴿وَاِذِ ابۡتَلٰۤى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ﴾ "اور یاد کرو کہ جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے بڑی بڑی باتوں میں تو وہ ان سب میں پورا اتر گیا" —— یہاں لفظ ابتلاء آگیا۔ اس کے معنی ہیں کسی کو آزمانا' امتحان و آزمائش میں ڈالنا —— یہاں لفظ بِكَلِمٰتٍ میں تنوین تنکیر کے لئے آئی ہے 'یعنی اس نے اس کو نکرہ بنادیا ہے 'اور تنکیر عربی زبان میں تفخیم کے لئے یعنی کسی چیز کی عظمت و شان کو بیان کرنے کے لئے آتی ہے۔ چنانچہ بِكَلِمٰتٍ میں بڑے بڑے اور کٹھن امتحانات کا مفہوم شامل ہو گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس کے رب نے بڑے سخت اور مشکل امتحانات لئے 'لیکن اس اللہ کے بندے نے سب کو پورا کر دکھایا۔ فَاَتَمَّهُنَّ۔

اس کی قوتِ ارادی میں کہیں ضعف و تأمل پیدا نہیں ہوا' اس کی عزیمت میں کمزوری اور تذبذب کے کہیں آثار ہویدا نہیں ہوئے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ان امتحانات کو پاس کر گئے تو ان کو یہ بشارت دی گئی : ﴿ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ﴾ "(اللہ تعالیٰ نے) کہا (اے ابراہیم علیہ السلام) یقیناً میں تجھے پوری نوعِ انسانی کا امام بنانے والا ہوں۔" حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بربنائے طبعِ بشری فوراً سوال کیا : ﴿ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ﴾ عرض کیا: اے اللہ! یہ وعدہ صرف مجھ ہی سے ہے یا میری نسل سے بھی ہے؟ ﴿ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴾ "فرمایا : میرا یہ عہد ظالموں کے ساتھ نہیں ہوگا"۔ تمہاری نسل میں سے جو ظالم ہوں گے وہ اس وعدے کے مستحق نہیں ہوں گے —— "ظلم" کے متعلق ہمارے اکثر دروس میں ذکر ہو چکا ہے کہ قرآن کریم میں اکثر و بیشتر "ظلم" کے لفظ سے شرک مراد ہوتا ہے —— تمہارا اصل کمال یہ ہے کہ تم نے توحید کی ترازو میں پورا اتر کر دکھایا۔ اس کی وجہ سے تم "امام النّاس" کے مقام پر فائز کئے جا رہے ہو۔ اب تمہاری نسل میں سے جو لوگ مشرک ہو جائیں گے تو وہ میرے اس عہد کے حق دار کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس مفہوم کو بھی علامہ اقبال مرحوم نے بڑے سادہ الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر لائق میراثِ پدر کیونکر ہو؟

معاملہ کسی اصول کے تحت ہوگا۔ محض نسل کے اعتبار سے ہو تو یہ انصاف اور عدل و قسط کے منافی ہوگا۔

فکر و نظر کا امتحان :

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پہلا امتحان تو ان کے فکر و نظر اور عقل و شعور کا تھا۔ اس امتحان میں انہوں نے کتنی عظیم الشان کامیابی حاصل کی' اس کا ذکر سورۃ الانعام میں ہے۔ انہوں نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جس

میں ہر نوع کے شرک کے گھٹاٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔ توحید کی کوئی کرن کہیں موجود تھی ہی نہیں۔ شرک کی جتنی اقسام ہو سکتی ہیں وہ سب کی سب موجود تھیں۔ سیاسی شرک، یعنی غیر اللہ کی حاکمیت کا شرک وہاں موجود تھا، بادشاہِ وقت نمرود خدائی حقوق کا دعوے دار بن کر تختِ حکومت پر متمکن تھا۔ مذہبی شرک کی حیثیت سے ستارہ پرستی وہاں مروج تھی۔ سورج، چاند، ثریّا اور دوسرے ستارے وہاں پوجے جا رہے تھے۔ اصنام پرستی وہاں موجود تھی، بُت کدے وہاں موجود تھے۔ اسی طرح پروہتوں اور پنڈتوں کا نظام وہاں موجود تھا۔ یہ تفصیل اگرچہ قرآن حکیم میں تو بیان نہیں ہوئی لیکن عام روایت یہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خود ایک پروہت کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ آزر صنم گر بھی تھا اور ان کے ہاں جو مذہبی monarchy رائج تھی اس میں اس کے پاس ایک اہم منصب تھا۔ تو تمام انواع و اقسامِ شرک موجود، شرک کا گھٹاٹوپ اندھیرا، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی فطرت و عقلِ سلیم کی رہنمائی میں نظری، فکری اور عقلی سفر کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر یہ نعرۂ توحید ان کی زبان پر آتا ہے:

﴿ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴾ (الانعام : ۷۹) یہ نعرۂ مؤمنانہ اس ماحول میں دراصل نعرۂ بغاوت ہے کہ: "میں تمہارے تمام معبودوں کا انکار کرتا ہوں اور میں نے یک سُو ہو کر اپنا رُخ اس ذات کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے"۔ پھر انہوں نے بڑے مؤثر انداز میں اپنے والد اور اپنی قوم کی گمراہیوں پر ٹوکا، جیسا کہ سورۃ الانعام میں مذکور ہے:

﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّیْۤ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ ﴾ (الانعام : ۷۴)

"ابراہیمؑ کا واقعہ یاد کرو جب کہ اس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا: کیا تو بُتوں کو خدا بناتا ہے؟ میں تو تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں"۔

سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہے :

﴿ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِیْلُ الَّتِیْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴾

(الانبیاء : ۵۲)

"یاد کرو وہ موقع جبکہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ یہ مورتیں کیسی ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ ہو رہے ہو؟"

غرض مختلف پیرایۂ بیان اور اسالیب سے آپؑ بار بار اپنے والد اور قوم سے کہتے ہیں کہ کیا ہیں یہ مورتیاں جو تم نے گھڑلی ہیں، جن کا تم دھیان اور گمان کر کے بیٹھے ہو جن کی تم ڈنڈوت کرتے ہو۔

﴿ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝ ﴾ (الصّٰفّٰت : ۹۵)

"(ابراہیمؑ نے) کہا : کیا تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو؟"

پھر آخری چوٹ لگاتے ہیں یہ فرما کر کہ :

﴿ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾

(الانبیاء : ۶۷)

"(تمہیں کیا ہو گیا ہے؟) تف ہے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کر رہے ہو۔ کیا تم عقل سے بالکل عاری ہو چکے ہو؟"

پھر پوری جرأت مؤمنانہ کے ساتھ چیلنج کرتے ہیں :

﴿ وَ تَاللّٰهِ لَاَكِیْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ ۝ ﴾

(الانبیاء : ۵۷)

"اور خدا کی قسم! میں تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے ان بتوں کے ساتھ کوئی معاملہ کر کے رہوں گا (ان کی خبر لے کے رہوں گا)۔"

یہ جو نعرہ ہے، یہ جو بیداری ہے، یہ جو عزائم ہیں، ایک ایسے ماحول میں جہاں توحید باری تعالیٰ سے کوئی ادنیٰ سی واقفیت بھی موجود نہیں ہے، تو یہ ان کی فطرت و عقل سلیم کی آزمائش کا پہلا مرحلہ ہے، پہلا امتحان ہے، جس میں وہ شاندار طریقے پر کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

قوتِ ارادی کی آزمائش :

اب دوسرا امتحان عمل کا شروع ہوا۔ قوتِ ارادی کی آزمائش کی ابتداء ہوئی۔ سیرت و کردار کی پختگی کو کسوٹی پر پرکھنے کے عمل کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلی کشمکش تو اپنے والد سے ہوتی ہے۔ سورۂ مریم میں اس کا ذکر ہے۔ کیسی لجاجت کے ساتھ اپنے والد کو توحید کی دعوت پیش کرتے ہیں کہ ابا جان! آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟

﴿ يٰاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴾

"ابا جان! شیطان کی بندگی (اور پرستش) نہ کیجئے! بلاشبہ شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔"

﴿ يٰاَبَتِ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝ ﴾

"ابا جان! مجھے اس کا بڑا اندیشہ ہے کہ آپ کو رحمٰن کی طرف سے عذاب آ دبوچے (اور آپ کو اللہ کی سزا پکڑ لے) اور آپ شیطان کے ساتھیوں میں سے ہو جائیں۔"

اس سے پہلے بڑی لجاجت سے کہہ چکے ہیں کہ :

﴿ يٰاَبَتِ اِنِّىْ قَدْ جَاۗءَنِىْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِىْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ ﴾

"ابا جان! میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا، پس آپ میری پیروی کیجئے۔ میں آپ کو بتاؤں گا کہ سیدھا راستہ کون سا ہے!"

لیکن اس تمام لجاجت اور پورے ادب و احترام کو پیش نظر رکھتے ہوئے پیش کی ہوئی دعوت کا جو جواب ملا وہ یہ تھا کہ :

﴿ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِىْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِىْ مَلِيًّا ۝ ﴾

"اس نے کہا: اے ابراہیم! کیا تم میرے معبودوں سے روگردانی کر رہے ہو (ہماری قومی و نسلی روایات کو اپنے پاؤں تلے روند دینا چاہتے ہو؟) اگر تم باز

نہیں آؤ گے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا۔ (یہ تو خیر بعد کی بات ہے) اس وقت تم میری نظروں سے دور ہو جاؤ (اور فوراً میرے گھر سے نکل جاؤ)"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جواب میں کہتے ہیں :

﴿ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۖ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ ﴾

"کہا : آپ پر سلامتی ہو، میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ وہ آپ کو معاف کر دے۔ یقیناً میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔"

وہ اللہ کا بندہ گھر سے نکل رہا ہے باپ کو سلام کر کے۔ اس جھڑکی، سنگسار کرنے کی دھمکی اور گھر سے ہمیشہ کے لئے نکالے جانے پر بھی اللہ کا یہ بندہ کہتا ہے کہ "سَلٰمٌ عَلَيْكَ" اور اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ میں اپنے رب کی بارگاہ میں، جو مجھ پر بڑا مہربان ہے، آپ کے لئے استغفار کروں گا۔ ارادے، عزم اور سیرت و کردار کی پختگی کا یہ پہلا امتحان ہے جس میں حضرت ابراہیم (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) پورے اترتے ہیں۔

بُت شکنی کا اقدام :

اب آیا معاملہ عوام کا —— وہ عوام جو فی زمانہ خدائی کے مدّعی ہیں۔ کبھی ایک فرد حاکمیتِ مُطلقہ کا مدعی ہوا کرتا تھا، اب عوام اس کے مدعی ہیں —— بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا —— اب آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے جذبات و احساسات اور ان کے عقائد کا اندازہ کیجئے —— کسی کو ہندو قوم کا ذرا سا بھی تجربہ ہو تو وہ جانتا ہو گا کہ بُتوں کے بارے میں اور ان کے جو بُت کدے اور اصنام خانے ہیں ان کے بارے میں ان کے جذبات و احساسات کیا ہیں؟ ایسے شخص کو اندازہ ہو گا کہ کتنی جرأتِ مؤمنانہ تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اور انہوں نے کس قدر عظیم کام کیا کہ اُن کے سب سے بڑے صنم خانے میں جا کر اُن کے تمام بُتوں کو، سب سے بڑے بُت کو چھوڑ کر، توڑ پھوڑ ڈالا اور بایں طور ان کے باطل عقائد پر ضرب کاری لگا دی۔ یہ واقعہ سورۃ الانبیاء میں قدرے تفصیل سے آیا ہے۔ انہوں نے قسم کھائی

تھی کہ میں ان بتوں کی خبر لوں گا۔ چنانچہ ایک موقع پر جبکہ شہر کے تمام لوگ کسی تہوار کے سلسلے میں پوجا پاٹ اور میلہ میں شرکت کے لئے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے، جیسے ہندوؤں میں بھی بعض تہوار شہر سے باہر منائے جاتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے سب سے بڑے بت کدے میں جاکر ان کے بڑے بت کو چھوڑ کر باقی سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور تیشہ بڑے بت کے گلے میں لٹکا دیا۔ یہ اس لئے کہ شاید ان کی قوم حقیقتِ نفس الامری کی طرف رجوع کر سکے۔ قرآن مجید اس واقعہ کا اس طرح ذکر کرتا ہے :

﴿ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ○ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ○ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ○ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ○ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ○ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ○ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ○ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ○ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ○ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ○ ﴾ (الانبیاء : ۵۸ تا ۶۷)

"چنانچہ اس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور صرف اُن کے بڑے کو چھوڑ دیا، تاکہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ (انہوں نے آکر بتوں کا یہ حال دیکھا تو) کہنے لگے: ہمارے خداؤں کا یہ حال کس نے کر دیا؟ بڑا ہی ظالم تھا وہ۔ (بعض لوگ) بولے: ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا، جس کا نام ابراہیم ہے۔ انہوں نے کہا: تو پکڑ لاؤ اسے سب کے سامنے تاکہ لوگ دیکھ لیں (کہ اس کی خبر کیسے لی جاتی ہے) (ابراہیم علیہ السلام کے آنے پر) انہوں نے پوچھا: کیوں ابراہیم! تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ اس نے جواب دیا: بلکہ یہ سب کچھ ان کے اس سردار نے کیا ہے، ان ہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے

ہیں۔ یہ سن کر وہ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور (اپنے دلوں میں) کہنے لگے: واقعی تم خود ہی ظالم ہو۔ مگر پھر ان کی مت پلٹ گئی اور بولے: تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کو پوج رہے ہو جو نہ تمہیں کچھ نفع پہنچانے پر قادر ہیں اور نہ نقصان۔ تف ہے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کر رہے ہو۔ کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے؟"

ان آیات میں ﴿ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓی اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ﴾ والی آیت خاص طور پر قابل غور ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسلوبِ گفتگو، اندازِ تبلیغ اور استدلال و حجت نے ان مشرکوں کو نہ صرف مبہوت اور لاجواب کر دیا، بلکہ اس کا اس حد تک اثر ہوا کہ لوگوں نے اپنے گریبانوں میں جھانکا اور محسوس کر لیا کہ بات ابراہیم ہی کی صحیح ہے، اصل میں ہم ہی غلطی پر ہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بطورِ حجّت اُن سے یہ کہا: ﴿ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝ ﴾ اس بڑے بُت نے توڑ پھوڑ کا یہ کام کیا ہو گا، چونکہ یہ موقع واردات پر موجود بھی ہے اور آلۂ واردات بھی اس کے پاس ہی سے برآمد ہوا ہے۔ گویا عام واقعاتی شہادتیں (Circumstancial Evidences) تو اس بڑے بُت کے خلاف جا رہی ہیں۔ پھر یہ تمہارے معبود ان جو ٹوٹے پھوٹے اور بکھرے پڑے ہیں، تو اگر یہ بول سکتے ہوں تو انہی سے پوچھ لو کہ ان کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی ہے؟ اس حجت سے انہوں نے اپنے دلوں میں محسوس تو کر لیا کہ مت تو ہماری ہی ماری گئی ہے، یہ بُت بول کب سکتے ہیں! اور یہ بات ان کی زبان پر بھی آ گئی کہ اے ابراہیم! تُو تو جانتا ہی ہے کہ یہ بول نہیں سکتے۔ لیکن دل میں کسی حقیقت کا منکشف ہو جانا اور بات ہے اور اس حقیقت کو دل و جان سے قبول کر لینا اور اس کا اقرار کر لینا بالکل دوسری بات ہے ؎

زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است!

دنیا میں ہر دور میں ایسے اشخاص کی کمی نہیں رہی، بلکہ معتدبہ تعداد رہی ہے جن پر حقیقتِ نفس الامری منکشف تو ہو جاتی ہے لیکن ان میں اس کو قبول کرنے کی ہمت اور حوصلہ نہیں ہوتا —— مقابلتاً ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں جن کے اندر کی بصیرت اور اندر کا انسان بالکل مر چکا ہوتا ہے اور ان کی عقل پر پتھر پڑ چکے ہوتے ہیں —— اگر انسان کے باطن میں حیاتِ معنوی کسی درجے میں باقی ہو تو حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے۔ لیکن اس انکشافِ حقیقت کا اعتراف کر لینا اور اس کو تسلیم و قبول کر لینا آسان کام نہیں ہے —— مصلحتیں ہیں، چودھراہٹیں ہیں، مفادات ہیں، جو دامن کو پکڑ لیتے ہیں۔ اب وہاں جو پُجاری، پنڈت اور پروہت ہوں گے ان کے مفادات اور ان کے vested interests آخر کیسے پوجا پاٹ اور اصنام پرستی کے نظام کے خاتمے کو گوارا کر لیتے؟ اصنام پرستی کے نظام میں جو نذرانے بُتوں پر چڑھائے جاتے ہیں غور کیجئے کہ وہ نذرانے اور وہ حلوے مانڈے آخر کہاں جاتے ہیں؟ وہ ان ہی پروہتوں اور پنڈتوں کے یہاں ہی تو جاتے ہیں —— پھر بادشاہی کا جو نظام چل رہا ہوتا ہے وہ بھی ان نذرانوں اور چڑھاووں سے اپنا حصّہ وصول کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حجت کی اس عملی تدبیر سے ان پر حقیقت تو منکشف ہو گئی لیکن وہ اس کو قبول نہ کر سکے —— اس امتحان میں بھی حضرت ابراہیم (علیٰ نبینا وعلیہ الصّلوٰۃ والسلام) سرخرو ہوتے ہیں۔ ورنہ خود سوچئے کہ اس situation میں ایک mob کا مواجہہ کرنا کیا آسان کام تھا؟

حاکمِ وقت سے مباحثہ :

عوام کے ساتھ اس مقابلے میں کامیاب ہو جانے کے بعد اب حکومت و اقتدارِ وقت سے مقابلہ کی نوبت آتی ہے اور اس سے محاجّہ، مباحثہ اور تصادم ہوتا ہے —— عوام کے ساتھ جو معاملہ ہوا اس کا ذکر سورۃ الصافات میں بھی ہے اور زیادہ تفصیل کے ساتھ سورۃ الانبیاء میں ہے —— البتہ بادشاہِ وقت کے دربار میں جو پیشی ہوئی، اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں ہے۔ فرمایا :

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ؕ ﴾

(البقرۃ : ۲۵۸)

"کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیمؑ سے جھگڑا کیا تھا؟ جھگڑا اس بات پر کہ ابراہیمؑ کا رب کون ہے اور اس بناء پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا : زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔"

ایک عظیم شہنشاہ کے دربار میں پیشی ہے جو خدائی کا بھی مدّعی ہے۔ ذرا چشمِ تصوّر سے دیکھئے کہ اس کے دربار کے کیا ٹھاٹ باٹ ہوں گے! کتنا بارعب ماحول ہو گا! عمائدینِ سلطنت ہاتھ باندھے صف در صف کھڑے ہوں گے۔ سب کی گردنیں خم اور نگاہیں نیچی ہوں گی۔ کسی کی مجال نہیں ہو گی کہ شہنشاہِ وقت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے، لیکن اس بارعب ماحول میں وہ نوجوان پوری طمانیتِ خاطر کے ساتھ پیش ہوتا ہے۔ اسے کوئی خوف نہیں، کوئی اندیشہ نہیں، کسی قسم کا کوئی ہراس نہیں اور وہ پوری دلیری کے ساتھ اس خدائی کے دعوے دار شہنشاہ سے محاجّہ کرتا ہے اور علی الاعلان کہتا ہے کہ ﴿ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ﴾ اس بیوقوف نے بحث میں الجھنے کی خاطر کہا کہ ﴿ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ﴾ "میں بھی جِلاتا اور مارتا ہوں" یہ اختیار تو میرے ہاتھ میں بھی ہے —— روایات میں آتا ہے کہ یہ کہنے کے بعد اس نے جیل سے دو قیدیوں کو بلایا، ایک کی گردن اڑا دی اور ایک کو آزاد کر دیا کہ جاؤ مزے کرو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ تم نے دیکھا میرا اختیار! میں نے ایک کو مروا دیا اور ایک کو زندہ رکھا —— اس کی اس کج بحثی کا رویہ دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فوراً آخری حجت پیش کر دی : ﴿ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ﴾ "ابراہیم نے کہا کہ (میرا) اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے (اگر تجھ میں خدائی کا کچھ اختیار ہے تو) تُو اسے مغرب سے نکال کر دکھا۔"

—— اس حجت قاطعہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ : ﴿ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ﴾ "(یہ سن کر) وہ منکرِ حق ششدر ہو کر رہ گیا" —— اس امتحان میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کامیاب ہو گئے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق !

اب آیا ایک اور بڑا امتحان۔ یہ امتحان دنیا میں اکثر لوگوں کو پیش آتا رہتا ہے۔ نمرود نے جب اس محاجّہ میں نہ کی کھائی تو اس نے طیش میں آکر کہا کہ اب آخری فیصلہ کر لو۔ زندگی عزیز ہے تو اس مسلک کو اور اس دعوتِ توحید کو چھوڑنا ہو گا اور اگر اسی مقصد پر ڈٹے رہو گے تو موت تمہارا مقدر ہو گی۔ ہمارے محاورے میں یوں کہہ لیجئے کہ تمہیں پھانسی کے پھندے کو چوم کر گلے میں ڈالنا ہو گا۔ یا جیسے سقراط سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں زہر کا پیالہ پینا ہو گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فیصلہ اس کے سوا کیا ہوتا کہ اپنے موقف سے سرمو ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' ان کا موقف تو یہی رہا کہ :

﴿ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ○ ﴾

(الانعام : ۱۶۳)

زندگی جاتی ہے تو جائے توحید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا —— شہنشاہِ وقت کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عزیمت کو دیکھ کر طیش اور غضب سے کیا حال ہوا ہو گا' اس کا آپ حضرات بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس نے محاجّہ میں اپنی شکست کی شرمساری سے بچنے کے لئے اور اپنے عمائدین اور عوام کے مطالبے پر حکم دیا کہ ابراہیم کو آگ کے الاؤ میں جلا ڈالو اور اس طور پر اپنے معبودوں کی حمایت کرو اگر تم کو کچھ کرنا ہی ہے ﴿ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ○ ﴾ (الانبیاء : ۶۸)

چنانچہ انہوں نے ایک بہت بڑا آگ کا الاؤ دھکایا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میں کود پڑنے کے لئے کہا گیا اور وہ کود گئے۔ اس کو بھی علامہ اقبال مرحوم نے

بڑی خوبصورتی سے شعر کا جامہ پہنایا ہے' وہ کہتے ہیں ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی!

دیکھئے' یہاں بڑی پیاری بات آ گئی ہے۔ عقل کا امتحان توحید باری تعالیٰ کی معرفت کے مرحلے میں تھا۔ اس موقع پر عقل کا امتحان نہ تھا —— عقل تو ایسے مواقع پر یہ سمجھائے گی کہ جان بچاؤ۔ عقل تو ایسے حالات میں انسان کو مصلحتوں کا راستہ دکھاتی ہے۔ عربی زبان میں "عقل" کہتے ہیں باندھنے کو۔ عربوں کے سر پر رومال جس چیز سے بندھا ہوتا ہے اسے "عِقال" کہا جاتا ہے اور یہ اسی لفظ "عقل" سے بنا ہے۔ اصل میں یہ ماضی کے ایک دستور کی یادگار ہے۔ عرب کے بدّو کی کُل کائنات اس کا اونٹ ہوا کرتا تھا۔ اسی پر اس نے سفر کرنا ہے' اسی کا دودھ پی لینا ہے' اسی کا گوشت کھا لینا ہے' اسی کی کھال سے خیمے اور کمبل تیار کرنے ہیں اور اسی کے اون سے کچھ چیزیں تیار کر لینی ہیں۔ ایسا بھی وقت آتا تھا کہ لق و دق صحرا میں اگر پانی دستیاب نہیں ہے تو اسی کا پیشاب پی لینا ہے۔ گویا ایک بدّو کی پوری زندگی اونٹ کے گرد گھومتی تھی۔ لہٰذا اپنے اونٹ کو کہیں باندھنے کے لئے ہمیشہ اس کے پاس رسّی کا ایک ٹکڑا رہتا تھا کہ جہاں وہ اونٹ سے اترا اس نے رسّی کے ایک سرے سے اونٹ کا ایک گھٹنا باندھ دیا۔ وہ رسّی "عِقال" کہلاتی تھی' یعنی گھٹنا باندھنے والی چیز —— اب اسی رسّی کو ہر وقت اپنے پاس رکھنا ہے تو اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ جب اونٹ کے گھٹنے سے رسّی کھولی تو اسے سر پر پڑے ہوئے رومال پر لپیٹ لیا۔ اس طرح یہ ان کی ایک علامت اور ان کا ایک دستور بن گیا اور شعائرِ قومی میں سے ان کے لباس کا ایک جزو بن گیا —— جیسے آپ کو کوئی پٹھان مشکل ہی سے ایسا ملے گا جس کے کاندھے پر چادر نہ ہو —— یہ چادر اس کے لباس کا جزو لازم بن گئی ہے۔ اسی طرح یہ عقال عربوں کے لباس کا ایک جزو لازم بن گیا ہے۔ یہ لفظ حدیث شریف میں بھی آتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب مسجد نبویؐ میں آئے اور باہر اونٹ کو چھوڑ کر

آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم نے اونٹ کو باندھا نہیں' تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اللہ پر توکّل کیا۔ حضور ﷺ نے فوراً تعلیم فرمائی : ((اِعْقِلْهَا ثُمَّ تَوَكَّلْ)) "پہلے اونٹ کو باندھو' پھر اللہ پر توکّل کرو"۔ گویا اسلامی توکّل یہ نہیں ہے کہ اسباب کو ترک کر دیا جائے۔ ہر کام کے لئے حتی الامکان اسباب جمع کرو' پھر اللہ پر توکّل کرو کہ اصل میں ان اسباب سے کچھ نہیں ہو گا' ہو گا وہی جو مسبّب الاسباب یعنی اللہ چاہے گا —— بہرحال عقل کے معنی کے بیان میں یہ جملہ ہائے معترضہ درمیان میں آ گئے۔ میں جو کچھ عرض کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ جہاں تک جرأتِ عملی کا تعلق ہے وہاں عقل ساتھ نہیں دیتی' وہاں جذبات کام دیتے ہیں۔ عقل تو روکتی ہے' وہ تو یہ راہ سمجھاتی ہے کہ اس وقت جان بچاؤ' تاکہ مستقبل قریب میں مناسب وقت پر کلمہ خیر کہہ سکو —— اِس وقت کوئی توریہ کر لو' کسی اور حیلے سے جان بچاؤ۔ تم ختم ہو گئے تو یہ دعوت ہی ختم ہو جائے گی۔ پھر یہ کلمۂ توحید اور کلمۂ حق کہنے والا ہی کوئی نہیں رہے گا۔ تم یہاں سے جان بچا لو گے تو باہر جا کر کوئی شکل پیدا کر سکو گے۔ البتہ راہ کے تعین میں عقل مُمِد ہوتی ہے۔ یہ کام جذبات کے حوالے کیا گیا تو معاملہ غلط ہو جائے گا۔ چنانچہ ان میں توازن ضروری ہے۔ عقل سے روشنی حاصل کرو۔ جانا کدھر ہے' مقصد کا تعین اور رُخ کا صحیح تعیّن تو عقل ہی کرے گی۔ جذبات غلط رُخ پر ڈال دیں گے۔ لیکن جب راہ کا تعین ہو گیا کہ جانا کدھر ہے تو چلنے کے لئے اب عقل کو ایک طرف رکھنا ہو گا۔ اب جذبات ہوں گے جو آگے لے کر چلیں گے۔ پھر یہ جذبات ہی اس راہ کی مشکلات' موانع' تکالیف اور شدائد و مصائب سے نبرد آزما ہوں گے۔ عقل ان سے نبرد آزما نہیں ہو سکتی۔ یہاں عشق اور جذبات کی ضرورت ہوتی ہے جس کے بغیر ایک قدم بھی آگے بڑھنا مشکل ہے۔ وہی ان تمام سے نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ پس عقل سے روشنی حاصل کرو اور جذبات کے تحت حرکت کرو۔ یہ توازن ازبس ضروری ہے اور یہی توازن ہے جو اکثر لوگوں کو نصیب نہیں ہوتا۔

بہرحال ان لوگوں نے آگ کا ایک الاؤ تیار کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میں جھونک دیا۔ سورۃ الانبیاء کے علاوہ اس واقعہ کا سورۃ الصافات کی آیات ۹۷، ۹۸ میں بھی ذکر موجود ہے۔ وہاں یہ حال ہے، بقولِ جگر مُراد آبادی ؎

نہ لا وسواس دل میں جو ہیں تیرے دیکھنے والے
سرِ مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی!

سورۃ الانبیاء میں ذکر ہے کہ ﴿ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ ﴾ "ہم نے کہا: اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ پر" ﴿ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ۝ ﴾ "اور وہ (نمرود اور اس کی قوم کے لوگ) ابراہیمؑ کے ساتھ برائی کرنا چاہتے تھے، مگر ہم نے ان کو بُری طرح ناکام کر دیا" —— اور وہ آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں گل و گلزار بن گئی۔ وہ اللہ کا بندہ اس امتحان میں بھی کامیاب ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو معجزانہ طریقے پر بچالیا۔

اس کے بعد یہ جان لیجئے کہ انبیاء و رُسل کے باب میں اللہ کی سُنّت اور اس کا قانون یہ ہے کہ جب کسی ملک یا معاشرے کے لوگ نبی کی جان لینے کے درپے ہو جائیں اور اس پر ہاتھ ڈال دیں تو گویا یہ معاشرہ اس طرح یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اس کے اندر خیر کے قبول کرنے کا کوئی جوہر باقی نہیں ہے۔ گویا وہ اپنی محرومیت پر مُہرِ تصدیق ثبت کر چکا ہے۔ تو یہ وقت ہوتا ہے جب ہجرت کا مرحلہ آتا ہے اور نبی یا رسول کو حکم ہوتا ہے کہ اب یہاں سے ہجرت کرو اور کہیں اور چلے جاؤ۔ چنانچہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے نبی ﷺ کے قتل کا دارالنّدوہ میں فیصلہ ہو گیا تو مشرکینِ مکّہ کا یہ فیصلہ ہجرت کی تمہید بن گیا۔

ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت الی اللہ :

آگ کے الاؤ سے بچنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کا فیصلہ کیا : ﴿ وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝ ﴾ (الصافات : ۹۹) "اور ابراہیم نے کہا کہ میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں، وہی میری رہنمائی کرے گا"۔ یعنی میں اپنے

رب کی خاطر گھر بار اور وطن چھوڑ رہا ہوں۔ رہا یہ معاملہ کہ میرا آئندہ ٹھکانہ کہاں
ہو گا تو اس کو میں اس کے حوالے کرتا ہوں' وہ میری رہنمائی کرے گا —— یہ ہو
پانچواں امتحان' وطن کو خیرباد کہنا اور صرف اللہ کے بھروسے پر وہاں سے نکل جانا
کوئی منزل پیش نظر نہیں' کوئی منصوبہ بندی نہیں۔ توکل کا یہ عالم کہ "میرا رب جا
ہی رہنمائی فرمائے گا" —— یہ آج سے چار یا ساڑھے چار ہزار سال قبل کی بات
ہے۔ لہٰذا اس کو آج کے زمانے اور اپنے دور پر قیاس نہ کر لیجئے گا۔ اُس زمانے میں
اپنے وطن کو خیرباد کہنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اُس وقت انسان کو جغرافیہ کا کتنا ع
ہو گا اور اس کی کتنی معلومات ہوں گی کہ میرے ملک کے علاوہ کون کون سے قری
ممالک ہیں اور ان کے باشندوں کی مذہبی و معاشرتی کیفیات کیا ہیں!! یہ نہیں تھا کہ
یہاں بیٹھے آپ کے پاس امریکہ کے بڑے شہروں اور ہوٹلوں کے نام اور فون نمبر
تک موجود ہیں اور آپ یہاں سے باقاعدہ پیشگی بکنگ کرا کے جا رہے ہیں۔ اس معا
میں اُس وقت انتہائی غیر یقینی صورت حال تھی۔ توکّل و اعتماد تھا تو صرف اپنے رب
پر ﴿ قَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ﴾ یعنی میں اپنے رب کی خاطر اسی کی طرف
جا رہا ہوں' لہٰذا وہی میری رہنمائی کرے گا اور مجھے کوئی ٹھکانہ عطا فرمائے گا۔
ہجرت خالص الی اللہ تھی۔ وہ جو حدیث آتی ہے کہ : ((فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَ
اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ))[1] "پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے
رسول کی خاطر ہو گی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف شمار ہو گی"
اُس وقت بظاہر تو ہجرت ہو رہی تھی مدینہ کی طرف' لیکن اصل میں تو یہ ہجرت ال
اور اس کے رسول کی طرف تھی —— وہاں منزل کا پتہ تو تھا' لیکن یہاں تو ک
معلوم نہیں تھا کہ منزل کون سی ہو گی۔ لہٰذا میرے خیال میں حضرت ابراہ

---

(۱) رواہ البخاری فی بدء الوحی' وفی الایمان' باب ماجاء ان الاعمال بالنیۃ.. ومسل
(ح ۱۹۰۷) فی الامارۃ' وابوداؤد (ح ۲۲۰۱) فی الطلاق' والترمذی (ح ۱۶۴۷) فی فضائ
الجہاد' والنسائی (۱/۵۹'۶۰)

(علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کی یہ ہجرت، ہجرت الی اللہ کی کامل ترین نظیر ہے۔ اس ہجرت میں ان کے ساتھ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ اور ان کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام تھے۔ یہ دونوں آپؑ پر ایمان لا چکے تھے۔ حضرت لوطؑ کو بعد میں سدوم کی بستی کی طرف دعوتِ توحید اور رشد وہدایت کے لئے مامور فرما کر بھیج دیا تھا —— اسی دوران حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مصر کا سفر اختیار کیا، جہاں کے بادشاہ نے ایک شہزادی حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا آپؑ کو ہدیہ میں دی۔ میں ان تفاصیل کو چھوڑ کر آگے چلتا ہوں۔

اسمٰعیل اور اسحٰق علیہما السلام کی ولادت :

اس ہجرت کی زندگی میں احساس ہوا کہ کچھ اعوان وانصار ہوں، کوئی دست و بازو ہو، تو زبان پر دعا آئی :

﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ ﴾ (الصّٰفّٰت : ۱۰۰)

"اے میرے رب! مجھے صالح اولاد عطا فرما"۔

دعا قبول ہوتی ہے اور اس بوڑھے موحد کو ستاسی سال کی عمر میں حضرت اسماعیل (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) جیسا بیٹا حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے عطا ہوتا ہے۔ آپ کی پہلی اہلیہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا، جو آپ ہی کے خاندان سے تھیں اور جنہوں نے ہجرت میں آپ کا ساتھ دیا تھا، بانجھ تھیں۔ ان کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدائش کے بعد جب فرشتوں کے ذریعے اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دی گئی تو انہوں نے اپنا آپا پیٹ لیا تھا۔ اس کا ذکر سورۂ ہود میں آیا ہے :

﴿ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ ﴾ (ھود : ۷۲)

"وہ کہنے لگی: ہائے میری بدبختی، میں بوڑھی پھونس اور بانجھ، کیا اس عمر میں میرے یہاں اولاد ہو گی؟ جبکہ میرے شوہر بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ یہ تو بڑی انوکھی بات ہے۔"

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کا اللہ کی قدرت پر ایمان نہیں تھا یا وہ واقعی اولاد کی خوشخبری کو بد بختی سمجھتی تھیں' بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اَن ہونی خبر پر برنائے طبع بشری ایک عورت کے جو جذبات و احساسات ہو سکتے ہیں' وہ بے اختیار ان کی زبان پر آ گئے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے بعد کی پوری زندگی مسلسل مسافرت و مہاجرت کی داستان ہے۔ آج شام میں ہیں تو کل مصر میں' پرسوں اردن یا فلسطین میں' پھر حجاز کا بھی دورہ ہو رہا ہے۔ فکر ہے تو یہی کہ کلمۂ توحید سربلند ہو اور اس دعوت کے جابجا مراکز قائم ہو جائیں —— جب کہولت کے آثار کچھ زیادہ طاری ہوتے محسوس ہوئے تو یہ دعا زبان پر آئی کہ ﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ ﴾ اس کا جواب ملتا ہے : ﴿ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ ﴾ (الصافات : ۱۰۱) "پس ہم نے اسے ایک حلیم (بردبار) لڑکے کی بشارت دی۔" اللہ کی قدرت اور دین ہے' جس کو جو چاہے دے دے۔ چنانچہ اس بڑھاپے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک بردبار اور حلیم بیٹے اسمٰعیلؑ کی پیدائش کی خوشخبری دی جاتی ہے اور بعد میں حضرت اسحٰق کی ولادت کی' تو یہ بندۂ حنیف اللہ کے اس فضل و کرم پر بایں الفاظ شکر ادا کرتا ہے کہ :

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ﴾

"(ابراہیم علیہ السلام نے کہا) اس اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود اسماعیل اور اسحاق جیسے وارث عطا فرمائے۔"

جوانی کا دور ہوتا اور بیٹے ہو گئے ہوتے تو یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ عام عادی قانون یہی ہے۔ اس کا بھی شکر ایک مسلمان پر واجب ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہے "عَلَى الْكِبَرِ" کا۔ دعا کی اس مقبولیت پر دل کی گہرائیوں سے ترانۂ شکر ادا ہوا۔ اسی لئے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ :

﴿ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاءِ ۝ ﴾ (ابراھیم : ۳۹)

"بلاشبہ میرا رب دعا ضرور سنتا ہے۔"

امتحان و آزمائش کا نقطۂ عروج :

اب سورۃ الصافات میں (از آیت ۱۰۰ تا آیت ۱۱۱) چھٹے اور آخری امتحان کا ذکر شروع ہوتا ہے اور نہایت مختصر، لیکن جامع ترین الفاظ میں صورت حال کی ایک ایسی مکمل تصویر کھینچ دی جاتی ہے کہ ہم چشمِ تصوّر سے پورے واقعے کو ہر دور اور ہر زمانے میں دیکھ سکتے ہیں۔

﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ○ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ○ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ○ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ○ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰۗؤُا الْمُبِيْنُ ○ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ○ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ○ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ○ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ○ ﴾ (الصّٰفّٰت : ۱۰۰-۱۱۱)

"(ابراہیم علیہ السلام نے کہا) اے پروردگار! مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو۔ (اس دعا کے جواب میں) ہم نے اس کو ایک حلیم (بردبار) لڑکے کی بشارت دی۔ وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے اس سے کہا: بیٹا! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں، اب تُو بتا، تیرا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا: ابّا جان! جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالئے، آپ ان شاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ آخر کو جب ان دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا۔ اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم تُو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیئے میں دے کر اس (بچے) کو چھڑا لیا اور اس (قربانی) کو (بطور یادگار ہمیشہ کے لئے) بعد کی نسلوں میں چھوڑ دیا۔ سلام ہے ابراہیم پر۔ ہم

نیکو کاروں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً وہ ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھا۔"

بڑھاپے میں دعائیں کر کر کے تو اللہ سے بیٹا لیا اور وہ بھی کیسا بیٹا! حلیم، نہایت بردبار، سلیم الطبع، فرماں بردار، صابر اور سعادت مند —— لیکن اب آخری امتحان کے لئے اسٹیج سیٹ ہو رہا ہے۔ گویا قدرت مسکرا رہی ہے کہ ایک سو سالہ بوڑھے انسان کا امتحان، بڑا کڑا امتحان ابھی باقی ہے۔ یہ بڑے بڑے امتحانوں سے گزر کر آیا ہے، لیکن ابھی آخری تیر ایک بھاری اور مشکل امتحان کی صورت میں ہمارے ترکش میں موجود ہے —— امتحان کی گھڑی دیکھئے ﴿ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ ﴾ "تو جب وہ (بیٹا) اس (باپ) کے ساتھ بھاگ دوڑ کرنے کے قابل ہوا" تو اس امتحان کا وقت بھی آ پہنچا۔ بچہ اگر بالکل شیر خوارگی کی عمر میں ہوتا، بالکل چھوٹا سا ہوتا تو قدرے ہلکا امتحان ہوتا۔ لیکن اب تو کڑی سے کڑی آزمائش مطلوب ہے۔ ادھر بوڑھا باپ اپنے اکلوتے بیٹے کو جوان ہوتے دیکھ رہا ہے، اِدھر محبت و جذبات اور امیدوں اور تمناؤں کے امتحان کا مرحلہ آگیا —— اور اس کے لئے وقت منتخب کیا گیا جب زندگی کی بھاگ دوڑ میں وہ بوڑھے باپ کے ہاتھ کی لاٹھی بننے کے قابل ہو گیا، جدّ و جُہد اور محنت و مشقت میں ہاتھ بٹانے والا بن گیا۔ جس کو ہم کہیں گے کہ فی الحقیقت دست و بازو بن گیا —— اُس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر تیرہ سال تھی —— تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سے کہتے ہیں : ﴿ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ﴾ "اے میرے پیارے بچے! میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ (روایات میں آتا ہے کہ مسلسل تین رات یہ خواب آیا ہے) اب تم دیکھو، غور کرو اور بتاؤ کہ تمہاری کیا رائے ہے!" بیٹے کی رائے معلوم کر کے باپ بھی بیٹے کا امتحان لے رہا ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھئے کہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ سچا خواب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کی آخری، حتمی اور قطعی صورت "وحیٔ نبوّت" ہے۔

وحی نبوّت کا دروازہ نبی اکرم ﷺ پر تاقیامِ قیامت بند ہو گیا' لیکن اس سے کچھ کم تر چیزیں اب بھی باقی ہیں۔ الہام اب بھی ہے' کشف اب بھی ہے' القاء اب بھی ہے۔ اللہ اپنے جس بندے کے دل میں جو بات چاہے ڈال دے' اس کے لئے نبوت شرط نہیں ہے۔ نبوت خواتین کے لئے تو ہے ہی نہیں لیکن اللہ نے اُمِّ موسیٰ علیہ السلام کے دل میں بات ڈالی اور کتنے یقین کے ساتھ ڈالی کہ اپنے بچے کو خود اپنے ہاتھوں صندوق میں بند کر کے دریا کے حوالے کر دیا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اگر یہ یقین نہ ہوتا کہ بات مجھ پر القا ہوئی ہے' اگر ذرا بھی گمان ہوتا کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے' تو وہ یہ اقدام ہرگز نہیں کر سکتی تھیں! پس الہام' القاء' کشف اور رؤیائے صادقہ' یہ ساری چیزیں اب بھی ہیں۔ یہ چیزیں نبیوں کے لئے بھی تھیں اور غیر نبیوں کے لئے بھی —— خود نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ وحی نبوت کا دروازہ مجھ پر بند ہو گیا' لیکن رؤیائے صادقہ کا سلسلہ جاری رہے گا جو نبوت کا چھیالیسواں حصّہ ہے۔ ایک روایت میں سواں حصّہ بھی آیا ہے۔ البتہ نبیوں کے لئے یہ چیزیں' یعنی الہام' القاء' کشف اور رؤیا (خواب) بھی وحی کے درجے میں ہوتے ہیں اور ان میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ فوراً یقین کر لیتے ہیں کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔

اب بیٹے کی حلیمی کا اظہار ہو رہا ہے : ﴿ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ ﴾ "اس (بیٹے نے) کہا' ابا جان! کر گزریئے جو حکم آپ کو مل رہا ہے' آپ ان شاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے"۔ ﴿ فَلَمَّآ اَسْلَمَا... ﴾ "تو جب وہ دونوں مسلمان ہو گئے..." یہاں میں نے جان بوجھ کر "مسلمان ہو گئے" ترجمہ کیا ہے۔ اسلام' جس کو ہم نے بدنام کیا ہوا ہے' اسکے اصل معنی ہیں گردن نہادن' سرِ تسلیم خم کر دینا۔ جو بھی اللہ کا حکم ہے اسکی بلا چون و چرا اطاعت اور فرماں برداری کرنا "اسلام" ہے۔ بقول مولانا محمد علی جوہر مرحوم ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

اور بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

چوں می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را!

یہ ہے اسلام۔ ﴿ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ ﴾ پھر جب دونوں نے اسلام کا مظاہرہ کیا' دونوں نے گردن جھکادی' جب دونوں نے اللہ کے حکم کو بسرو چشم قبول کر لیا۔ اور اس (ابراہیمؑ) نے اس (اسماعیلؑ) کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا' تاکہ چہرہ سامنے نہ رہے اور جذباتِ فطری عین وقت پر جوش میں نہ آجائیں' بوڑھے ہاتھوں میں کہیں لرزش پیدا نہ ہو جائے۔ سو برس کا بوڑھا ہے جو اپنے تیرہ برس کے اکلوتے بیٹے کے گلے پر چھری پھیرنے کی تیاری کر رہا ہے —— ﴿ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ ﴾ "اور ہم نے اس کو پکارا اے ابراہیم!" (بس کر) ﴿ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ﴾ "بلاشبہ تو نے خواب کو سچ کر دکھایا" اس سے زائد ہمیں بھی درکار نہیں۔ یعنی ممتحن کو بس کرنا پڑی' جس کا امتحان لیا جا رہا تھا اس نے بس نہیں کی۔ چشمِ فلک اس نظارے کی تاب نہ لا سکی کہ ابراہیمؑ بیٹے کو بالفعل ذبح کر رہا ہے۔ امتحان پورا ہو گیا' تم آمادہ ہو گئے اور اپنی محبوب ترین شے کو اللہ کی محبت و اطاعت کی خاطر اور اس کی راہ میں قربان کرنے کے لئے جی جان سے تیار ہو گئے' لہٰذا امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ تمہاری کامیابی تسلیم۔ ﴿ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾ "ہم اسی طرح ان لوگوں کو جو محسن ہوتے ہیں' جو درجہ احسان پر فائز ہو جاتے ہیں' اپنے انعامات اور جزا سے نوازتے ہیں" —— محسن' احسان کرنے والے نہیں۔ ایک احسان دوسروں پر ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ مفہوم اردو میں مستعمل ہے۔ عربی میں احسان کا یہ مفہوم بھی ہے' لیکن اس کا اصل اور حقیقی مطلب و معنی کسی کام کو نہایت خوبصورتی سے کرنا ہے۔ اسلام میں جب کمال پیدا ہو جائے تو وہ احسان ہو جائے گا۔ حدیثِ جبرائیل میں یہ تین مراتب بیان ہوئے ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے اسلام' ایمان اور احسان تینوں کے بارے میں سوال کیا: اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ' اَخْبِرْنِیْ عَنِ

الْاِیْمَانِ اور اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ —— یہ بتایئے اسلام کسے کہتے ہیں؟ یہ بتایئے ایمان کسے کہتے ہیں؟ یہ بتایئے کہ احسان کسے کہتے ہیں؟ تو احسان ہمارے دین میں بہترین اعمال کی ارفع و اعلیٰ یعنی بلند ترین سطح کو کہا جاتا ہے۔ لہٰذا فرمایا : ﴿ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ ﴾ "اسی طرح ہم نیکو کاروں اور خوب کاروں کو جزا دیتے ہیں"۔ آگے فرمایا : ﴿ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ۝ ﴾ "واقعہ یہ ہے کہ یہ بڑا کھلا امتحان تھا، بہت کڑی آزمائش تھی" —— اب آپ خود ہی سوچئے کہ اس سے بڑا کامیابی کا درجہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود ممتحن پکار اٹھے کہ امتحان واقعی بہت کڑا، بہت مشکل اور بہت کٹھن تھا۔ اب معاملہ رہ کیا گیا تھا؟ چھری تو پھیر ہی دی تھی۔ لیکن اس چھری نے حکم الٰہی سے کام کیا نہیں۔

ذبح عظیم

اب آگے بڑھنے سے قبل اس ابتلاء، آزمائش اور امتحانات پر ایک نگاہِ بازگشت ڈال لیجئے جن سے گزرتا ہوا یہ سو سال کا بوڑھا اس آخری اور کڑے امتحان تک پہنچا ہے۔ والدین اور گھر بار کو اس نے چھوڑا اللہ کے لئے، قوم سے اس نے منہ موڑا اللہ کی توحید کے لئے، شہنشاہ اور اقتدارِ وقت سے وہ جا ٹکرایا اللہ کی توحید کے لئے، اپنی جان دینے پر وہ آمادہ ہو گیا اللہ کی توحید کے لئے، وطن کو اس نے خیرباد کہا اللہ کی توحید کیلئے —— اپنے اکلوتے تیرہ سالہ نوعمر بیٹے کو وہ ذبح کرنے کیلئے تیار ہو گیا حکم الٰہی کی تعمیل میں —— یہ آخری امتحان تھا، سب سے کڑا، سب سے مشکل —— اس کے نتیجے میں ہوا یہ کہ : ﴿ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ ﴾ "اور ہم نے اس (اسماعیل) کو چھڑایا ایک عظیم قربانی دے کر" —— یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ ان کے بدلے میں ایک بڑی قربانی دے کر خود اللہ تعالیٰ نے ان کو چھڑایا۔

یہ ذبح عظیم کیا تھا؟ اس کے متعلق روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنت کا ایک مینڈھا تھا۔ قرآن مجید میں جس بات کو مجمل چھوڑ دیا گیا ہو تو اس کی تفصیل کیلئے

ہمیں جناب محمد ﷺ کی طرف رجوع کرنا ہو گا' کیونکہ تبیین قرآن آپ کا فرضِ منصبی ہے' از روئے آیت قرآنی :

﴿ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ﴾

(النحل : ۴۴)

"(اے محمدؐ) ہم نے یہ ذکر (قرآن مجید) آپ پر نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جائیں جو ان کے لئے اتاری گئی ہے"۔

تو حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کا وہ مینڈھا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ ذبح ہوا ہے۔ اس کو "ذبح عظیم" اس اعتبار سے کہا گیا کہ جنت کا وہ مینڈھا زمین پر لا کر ذبح کیا گیا۔ اب اس ذبح عظیم کا سلسلہ ہے جو عید الاضحیٰ کے موقع پر ہر سال لاکھوں جانوروں کی قربانی کی شکل میں تواتر سے چلا آ رہا ہے۔ وہ یاد ہزاروں سال سے منائی جا رہی ہے۔ یہ جو جانور ہزاروں سال سے عید الاضحیٰ کے موقع پر ذبح ہوتے ہیں' یہ ایک اعتبار سے حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فدیہ ہیں اور دوسرے اعتبار سے ان کا مفاد یہ ہے کہ امّتِ مسلمہ کے ہر فرد کے دل میں یہ جذبہ ہر سال تازہ ہوتا رہے کہ وہ متاعِ دنیا کی محبوب ترین شے بھی اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار رہے۔ چنانچہ فرمایا :

﴿ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾

" اور ہم نے بعد کی نسلوں کے لئے اس (قربانی) کو (بطورِ یادگار) چھوڑ دیا۔ سلامتی ہو ابراہیم پر (جو اس کڑے امتحان میں پورا اترا) اور اسی طرح ہم محسنوں کی قدر دانی کرتے ہیں اور ان کو جزاء سے نوازتے ہیں"۔

ابراہیم علیہ السلام کی اس قربانی کے جذبے کی یادگار اللہ تعالیٰ نے آنے والوں کے لئے قائم کر دی —— آپ غور کریں کہ ابراہیم علیہ السلام پر سلام بھیجنے والوں کی اس وقت دنیا میں دو تہائی تعداد ہے۔ یہودی ہوں' عیسائی ہوں' وہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعظیم کرنے اور ان پر سلام بھیجنے والے ہیں اور ان کے نام لیوا ہیں۔ رہے مسلمان' تو وہ

اس کا سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں :

﴿ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ (آل عمران : ٦٨)

"ابراہیم سے قریب ترین رشتہ اور نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے ان کی پیروی کی' اور اب یہ نبیؐ اور اس پر ایمان لانے والے اس نسبت کے زیادہ حق دار ہیں۔ اور اللہ صرف ان کا دوست ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔"

پھر دیکھئے کہ ہر نماز میں آپ جو درود پڑھتے ہیں اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی درود بھیجا جاتا ہے' اسی لئے یہ درودِ ابراہیمی کہلاتا ہے۔

آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مدح میں فرمایا : ﴿ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ "یقیناً وہ (یعنی ابراہیمؑ) ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھا"۔

اب یہاں تین الفاظ نوٹ کر لیجئے : پہلا "اسلام" ﴿ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ ﴾ —— یہ اسلام ہے۔ اسی اسلام کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیان کے ضمن میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۳۱ میں ذکر ہے : ﴿ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ "ابراہیمؑ کا یہ حال تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا مسلم ہو جا تو اس نے فوراً کہا : میں ربِّ کائنات کا مسلم ہو گیا" —— حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اسی کیفیت تسلیم کو سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت ۸۴ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ ﴿ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝ ﴾ "جب وہ اپنے رب کے حضور قلبِ سلیم کے ساتھ پیش ہوا۔" ان کے مسلم ہونے کی اللہ خود ہی سند عطا فرما رہے ہیں۔ دوسرا "ایمان" —— اب اللہ تعالیٰ کسی کو "مؤمن" مان لے تو گویا اس کی طرف سے اسے ایک بہت بڑا سرٹیفکیٹ دے دیا گیا۔ چنانچہ فرمایا : ﴿ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ —— اب ذرا اسلام اور ایمان کی ان دو کسوٹیوں پر اپنے اسلام اور ایمان کو پرکھئے کہ ہم ان اعتبارات سے کس مقام پر کھڑے ہیں؟ ہم کتنے پانی میں

ہیں؟ اللہ کی راہ میں اپنی محبوب ترین چیز کو عملاً قربان کرنے پر آمادہ ہو جانا' زبانی کلامی نہیں' تو یہ ہے درجہ احسان —— اسلام' ایمان اور احسان' تینوں کی حقیقتیں اس ایک واقعہ سے ہمارے سامنے آ گئیں۔ ان ہی امتحانات سے گزرنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اس مرتبے کو پہنچے کہ ان کو امام النّاس کے مقام پر فائز کیا گیا اور ان کو خُلّتِ الٰہی سے نوازا گیا : ﴿ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۝ ﴾ (النساء : ۱۲۵)

فریضۂ حج اور حیاتِ ابراہیمیؑ کے مراحل

اب ایک اور بات جان لیجئے کہ حج کا یہ جو پورا سلسلہ ہے' یہ درحقیقت ایک فرض عبادت ہے ہر زادِ راہ رکھنے والے صاحبِ استطاعت مسلمان پر' از روئے نصِّ قرآنی :

﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۝ ﴾
(آل عمران : ۹۷)

"اور لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر (بیت اللہ) تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے"۔

پھر حج میں جو مناسک ادا کئے جاتے ہیں ان کو شعائر اللہ قرار دیا گیا ہے —— سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا :

﴿ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ ﴾ (آیت ۱۵۸)

"یقیناً صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس کے لئے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کر لے"۔

سورۃ الحج میں فرمایا کہ قربانی کے جانور بھی شعائر اللہ میں سے ہیں : ﴿ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ﴾ —— جبکہ بیت اللہ اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا شعیرہ ہے —— شعائر کے مجازی معنی ہیں "وہ چیزیں جن کے ادب و احترام کا

اللہ اور اس کے رسولؐ نے حکم دیا ہے"۔ اس کے ایک مجازی معنی نشانی اور علامت کے بھی آتے ہیں۔ حج کے یہ سب شعائر کیا ہیں؟ دراصل یہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کے مختلف مراحل ہیں۔ یہ اسی داستانِ عزیمت و امتحان کے مختلف ابواب اور ان کے اوراق ہیں جن کی ہر سال یاد منائی جاتی ہے۔ یہ جو بَیْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃ سعی ہو رہی ہے یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ حضرت ہاجرہ سلام اللہ علیہا کی اس عالم بے تابی کی نشانی ہے جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور وہ ننھی سی جان اسماعیلؑ پیاس سے تڑپ رہی تھی اور حضرت ہاجرہ پانی کی تلاش میں صفا اور مروہ کے درمیان سات مرتبہ دوڑی تھیں اور ہر چکر میں پہاڑ پر چڑھ کر پانی ڈھونڈنے کے لئے چاروں طرف نگاہیں دوڑاتی تھیں —— اللہ تعالیٰ کو اپنی اس مؤمنہ بندی کی یہ ادا اتنی بھائی کہ حج اور عمرہ کرنے والوں کے لئے مسعٰی میں دوڑنے کو شعائر اللہ میں سے قرار دے دیا۔ یہ اس لئے بھی ہوا کہ یہ حضرت ہاجرہ کے اللہ پر توکل اور صبر کی بھی ایک عظیم الشان نشانی ہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ اس لق و دق صحرا کی پہاڑیوں میں ان کو اور شیر خوار بچے کو چھوڑ کر جا رہے تھے تو حضرت ہاجرہ نے ان سے دریافت کیا تھا کہ آپ ہم کو کس کے حوالے کر کے جا رہے ہیں۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا تھا کہ اللہ کے حوالے۔ جس پر حضرت ہاجرہ نے کہا تھا : یہ صورتحال ہے تو میں راضی ہوں، آپ تشریف لے جایئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بے چینی کے عالم میں ایڑیاں رگڑنے سے معجزانہ طور پر چاہِ زم زم کا ظہور ہوا جس سے چار ہزار سال گزرنے کے بعد آج بھی لاکھوں بندگانِ خدا سیراب ہوتے ہیں۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی امتحان سے نہیں گزرے، بی بی ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ بھی نوعمری میں ہی امتحان سے گزرے ہیں۔ گویا ع "جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے"۔ سب سے زیادہ کٹھن امتحان سے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام گزرے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جن کا رتبہ بلند سے بلند تر

ہو گا اسی مناسبت سے ان کو آزمائشوں سے واسطہ بھی پڑے گا۔ جیسے جو پرائمری کا امتحان پاس کر لے اسے ہی مڈل' میٹرک اور پھر آگے کے امتحانات سے گزرنا ہو گا اور جو پرائمری ہی میں فیل ہو جائے اس کے لئے اگلے امتحانات کا کیا سوال؟ اگلے امتحان کا موقع تو بتدریج آتا ہے ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!

چنانچہ حج اور عید الاضحیٰ یہ دو اسلامی عبادات اور شعار دونوں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت کے گرد گھومتے ہیں' جن کی تعظیم و تکریم کرۂ ارض کے بسنے والوں کی دو تہائی آبادی کرتی ہے۔

عید الاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی

حج کا رُکنِ رکین تو وقوفِ عرفات ہے —— اس کے علاوہ سورۃ الحج میں دو بنیادی ارکان کا ذکر ملتا ہے' ایک اللہ کے نام پر جانور کی قربانی اور دوسرے بیت اللہ کا طواف۔ اور ان میں بھی زیادہ زور اور تکرار و اصرار قربانی پر ہے —— جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ حج ارکانِ اسلام میں سے جامع ترین رکن ہے۔ لیکن اس کا معاملہ یہ ہے کہ یہ ایک خاص مقام اور جگہ سے متعلق ہے۔ حج آپ کسی دوسرے مقام پر کر ہی نہیں سکتے۔ اس کی ادائیگی کے لئے تو آپ کو مقررہ تاریخوں اور دنوں میں ارضِ مقدس جانا پڑے گا اور اس میں ﴿ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ﴾ کی شرط موجود ہے۔ اس کی استطاعت ہر ایک کو تو حاصل نہیں ہے —— تو "مَالَا يُدْرَكُ كُلُّهُ لَا يُتْرَكُ كُلُّهُ" یہ ایک اصول ہے۔ عقل عام (Common Sense) کے تحت یہ کہا جاتا ہے کہ جو چیز کُل کی کُل حاصل نہ ہو سکتی ہو تو اسے کُل کی کُل کو چھوڑ ہی نہیں دینا چاہئے۔ اس میں سے جو کچھ بھی ملتا ہو وہ تو لو۔ بس اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ حج کے ارکان میں سے ایک رکن قربانی ہے۔ گویا بلاشبہ عید الاضحیٰ اور اس کے

ساتھ "قربانی" حج ہی کی توسیع کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ حج اس اعتبار سے ایک محدودیت کا حامل ہے کہ اس کے تمام مراسم و مناسک ایک متعین علاقے یعنی مکّہ مکرمہ اور اس کے نواح ہی میں ادا کئے جاتے ہیں اور کئے جاسکتے ہیں۔ اسی لئے اس کے ایک رکن یعنی اللہ کے نام پر جانوروں کی قربانی کو وسعت دے دی گئی ہے' تاکہ اس روئے زمین پر بسنے والا ہر مسلمان اس میں شریک ہو جائے اور یہی عید الاضحیٰ اور اس کے ساتھ قربانی کی اصل حکمت ہے —— لہٰذا واجب ہے کہ استطاعت رکھنے والا ہر مسلمان عید الاضحیٰ پر قربانی کرے۔ وہ بیت اللہ کا طواف نہیں کرپا رہا' وہ سعی بین الصفا والمروۃ نہیں کرپا رہا' وہ منیٰ میں قیام نہیں کر سکتا' وہ وقوفِ عرفہ سے محروم ہے۔ وہ ان تمام برکات سے تہی دست رہ گیا ہے تو اس میں ایک حصّہ ایسا ہے کہ جو مقام و مکان کی قید سے آزاد ہے' اس لئے وہ پورے کرۂ ارضی کے تمام مسلمانوں میں بانٹ دیا گیا ہے' سب کو جس میں شریک کرلیا گیا ہے' وہ ہے نماز عید الاضحیٰ اور اس کے ساتھ جانوروں کی قربانی۔ تاکہ دنیا بھر کے مسلمان اس کام میں شریک ہو جائیں۔

ایک بات نوٹ کر لیجئے کہ شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام سے قبل ارکانِ حج میں سے بہت بڑا رکن یہ قربانی ہی تھا۔ مثلاً سورۃ الحج میں' جس کا اکثر و بیشتر حصّہ مکّی ہے اور کچھ حصّہ دورانِ سفرِ ہجرت نازل ہوا ہے' حج کے احکام کا جو ذکر آتا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں سب سے زیادہ زور طواف اور قربانی پر ہے۔ لیکن سورۃ البقرۃ میں حج کے ارکان کا جو بیان آیا ہے اس میں قیامِ منیٰ' وقوفِ عرفات' قیامِ مزدلفہ اور وہاں پر ذکرِ الٰہی کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور وہاں قربانی کا ذکر نہیں ہے۔ آپ کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہو گی۔ اصل بات سمجھئے' وہ یہ کہ شریعتِ محمدیؐ میں حج کے موقع پر قربانی کی اہمیت کم ہو گئی ہے' اتنی نہیں رہی جتنی پہلے تھی۔ یہ باہر سے جانے والے جو قربانی دیتے ہیں یہ "تمتّع" کی قربانی دیتے ہیں' کیونکہ ایک ہی سفر میں وہ عمرہ بھی کر رہے ہوتے ہیں اور حج بھی۔ "تمتّع" اسی کو کہتے

ہیں۔ یہ اس تمتع کا شکرانہ ہے جو ہر شخص قربانی کی شکل میں کر رہا ہے۔ وہاں کا یعنی عرب کا جو مفرد حاجی ہے' اس پر قربانی واجب نہیں ہے۔ لیکن یہ قربانی پوری دنیا میں عام کر دی گئی ہے۔

اب ہمارے ہاں جو منکرینِ حدیث ہیں ان کی عقل بالکل الٹی ہے' ان کی مت ماری گئی ہے' لہٰذا غلط استدلال کرتے ہیں۔ وہ وہاں کی قربانی کے تو قائل ہیں' یہاں کی قربانی کے قائل نہیں ہیں۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہاں قربانی کا گوشت ضائع ہوتا ہے۔ حالانکہ عقلی طور پر یہ موقف بالکل غلط ہے۔ یہاں گوشت کی ایک بوٹی بھی ضائع نہیں ہوتی۔ گوشت ضائع تو وہاں ہوتا ہے۔ وہاں کا معاملہ یہ ہے کہ ایک ہی مقام پر لاکھوں جانور ذبح ہوتے ہیں۔ ضیاع بھی اگر کسی درجہ میں کوئی دلیل ہے تو ضیاع تو وہاں ہے' یہاں تو نہیں ہے۔ یہاں تو قربانی کے جانور کی اکثر و بیشتر کوئی چیز بھی ضائع نہیں ہوتی۔ کھالیں ضائع نہیں ہوتیں۔ ان کی قیمت فروخت سے ملک کے بے شمار دار العلوموں اور رفاہی اداروں کو ایک معقول آمدنی ہوتی ہے اور اس آمدنی سے بے شمار رفاہی کام انجام پاتے ہیں۔ بال ضائع نہیں ہوتے' ان سے اون تیار ہوتی ہے اور مختلف نوع کی صنعتوں میں کام آتی ہے۔ یہاں رودے ضائع نہیں ہوتے' آنتیں اور انتڑیاں تک ضائع نہیں ہوتیں' ان کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اب تو خون بھی جمع ہو رہا ہے جو پولٹری فیڈ میں استعمال ہو رہا ہے۔ ہڈیاں جمع ہو کر استعمال ہوتی ہیں۔ گویا قربانی کے گوشت کے علاوہ' جو کھانے کے کام آتا ہے اور اس کا کافی حصّہ ان لوگوں کو بھی پہنچ جاتا ہے جن بے چاروں کو اس مہنگائی کے دور میں شاید سال بھر کے دوران گوشت خریدنا نصیب نہ ہوتا ہو' اس کی ہر چیز استعمال میں آجاتی ہے۔ لہٰذا یہاں تو کسی چیز کے ضائع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں تو قربانی کے جانور کا ریزہ ریزہ آپ استعمال کر لیتے ہیں' جبکہ "منیٰ" میں منحر کے مقام پر جو قربانی ہوتی ہے اس کے گوشت کا کچھ حصّہ تو استعمال میں آتا ہے باقی رات کو بلڈوزر آتے ہیں اور تمام ذبح شدہ جانوروں کو کھال سمیت سمیٹ کر ایک گہرے

گڑھے میں دبا دیتے ہیں —— مزید یہ کہ مکّہ فتح ہوا ہے ۸ھ میں، جس کے بعد مسلمانوں کو حج کا موقع ملا ہے، لیکن احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ مدینہ منورہ میں اس فتح سے قبل ہی عید الاضحیٰ کے موقع پر نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قربانی کیا کرتے تھے۔ میں آپ کو وہ حدیث سنا چکا ہوں کہ آنحضور ﷺ سے صحابہؓ نے دریافت کیا تھا کہ "یارسول اللہ! ان قربانیوں کی نوعیت کیا ہے؟" تو جواباً آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا: ((سُنَّةُ اَبِيكُمْ اِبْرَاهِيمَ))۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان جب سیدھی راہ سے ہٹتا ہے تو اس کی عقل اوندھی ہو جاتی ہے اور وہ عقل عام یعنی Common Sense سے بھی تہی دست ہو جاتا ہے۔

دوسرے وہاں جو لوگ گئے ہیں وہ حرم شریف میں نمازیں ادا کر رہے ہیں، کعبہ شریف کا دیدار اور پھر اس کا طواف کر رہے ہیں۔ منیٰ میں قیام ہو رہا ہے۔ وقوفِ عرفات سے شاد کام ہو رہے ہیں۔ مزدلفہ میں ذکرِ الٰہی ہو رہا ہے، جیسا کہ حکم قرآنی ہے: ﴿ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ﴾ ان کو طوافِ قدوم، طوافِ افاضہ اور طوافِ وداع کی سعادتیں بھی نصیب ہو رہی ہیں۔ وہ سعی بھی کر رہے ہیں۔ تو ان کے لئے تو بہت سی برکات ہیں، جن میں ایک اضافی برکت قربانی کی بھی ہے۔ اور جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ قربانی مفرد پر تو واجب ہی نہیں ہے۔ اسی طرح قران کی نیت کرنے والے پر بھی قربانی واجب نہیں ہے۔ قران اس حج کو کہتے ہیں کہ اس نیت سے احرام باندھا جائے کہ اسی احرام میں عمرہ بھی کروں گا اور حج بھی —— قربانی تو صرف تمتع کرنے کی نیت والے حاجی پر واجب ہے یعنی وہ پہلے عمرے کی نیت کرے اور پھر عمرے کے بعد احرام کھول دے۔ پھر حج کے موقع پر دوبارہ حج کی نیت سے احرام باندھے۔ یعنی ایک ہی سفر میں آپ نے عمرہ اور حج دونوں کی سعادت حاصل کی۔ لہٰذا اس سہولت یعنی اس تمتع کے شکرانے کے طور پر آپ پر قربانی واجب ہو گئی۔ اب میری بات غور سے سماعت فرمائیے۔ وہ یہ کہ اصل میں شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں قربانی کی اہمیت اور

وجوب زیادہ ان لوگوں کے لئے ہے جو حج پر نہیں گئے تھے' لہٰذا حج کے سلسلہ کی بقیہ برکات سے محروم ہیں۔ ان کے لئے عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد رکنِ رکین در حقیقت یہ قربانی ہے' جو سنّتِ ابراہیم علیہ السلام سے متعلق ہے۔ گویا بھیڑوں' بکریوں' گایوں اور اونٹوں کی قربانی اصلاً علامت کی حیثیت رکھتی ہے اطاعت و فرماں برداری اور تسلیم و انقیاد اور اس پر مداومت اور استقامت کی اس روح کے لئے جو حضرت ابراہیم (علیٰ نبینا وعلیہ الصّلوٰۃ والسلام) کی پوری شخصیت میں رچی بسی ہوئی تھی اور ان کی پوری زندگی میں جاری و ساری رہی تھی۔

قربانی کی اصل روح :

البتہ یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ ہر چیز کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ نماز کا ایک ظاہر ہے' یعنی قیام ہے' رکوع ہے' سجود ہے' قعدہ ہے۔ یہ ایک خول اور ڈھانچہ ہے۔ اس کا ایک باطن ہے' یعنی توجہ اور رجوع الی اللہ' خشوع و خضوع' بارگاہِ رب میں حضوری کا شعور و ادراک' انابت' محبّتِ الٰہی —— نماز کی اصل روح اور جان تو یہی چیزیں ہیں ؎

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا سجود بھی حجاب ' میرا قیام بھی حجاب!

اسی طرح اس بات کو سمجھ لیجئے کہ جانور کو ذبح کرنا اور قربانی دینا ایک ظاہری عمل ہے۔ یہ ایک خول ہے۔ اس کا ایک باطن بھی ہے اور وہ "تقویٰ" ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں قربانی کے حکم کے ساتھ متنبہ کر دیا گیا کہ :

﴿ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ﴾ (الحج : ۳۷)

"اللہ تک نہیں پہنچتا ان قربانیوں کا گوشت اور ان کا خون —— ہاں اس تک رسائی ہے تمہارے تقویٰ کی"۔

اگر تقویٰ اور روحِ تقویٰ موجود نہیں' اگر یہ ارادہ اور عزم نہیں کہ ہم اللہ کے

دین کے لئے اپنی مالی وجانی قربانی کے لئے تیار رہیں تو اللہ کے ہاں کچھ بھی نہیں پہنچے گا۔ یعنی ہمارے نامۂ اعمال میں کسی اجر وثواب کا اندراج نہیں ہو گا۔ گوشت ہم کھالیں گے' کچھ دوست احباب کو بھیج دیں گے' کچھ غرباء کھانے کو لے جائیں گے' کھالیں بھی کوئی جماعت یا دار العلوم والے لے جائیں گے۔ لیکن اللہ تک کچھ نہیں پہنچے گا اگر وہ روح موجود نہیں ہے —— وہ روح کیا ہے؟ وہ تو امتحان' آزمائش اور ابتلاء ہے اور اس میں کامیابی کا وہ تسلسل ہے جس سے سیدنا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری زندگی عبارت ہے۔

ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ ہم سوچیں' غور کریں اور اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکیں کہ کیا واقعتاً ہم اللہ کی راہ میں اپنے جذبات واحساسات کی قربانی دے سکتے ہیں؟ کیا واقعتاً ہم اپنی محبوب ترین اشیاء اللہ کی راہ میں قربان کر سکتے ہیں؟ کیا واقعتاً ہم اللہ کے دین کی خاطر اپنے وقت کا ایثار کر سکتے ہیں؟ کیا ہم اپنے ذاتی مفادات کو اللہ اور اس کے دین کے لئے قربان کر سکتے ہیں؟ اپنے علائق دنیوی' اپنے رشتے اور اپنی محبتیں اللہ کے دین کی خاطر قربان کر سکتے ہیں؟ اگر ہم یہ سب کر سکتے ہیں تو عید الاضحیٰ کے موقع پر یہ قربانی بھی نورٌ علیٰ نورٍ —— اور اگر ہم اللہ کے دین کے لئے کوئی ایثار کرنے کے لئے تیار نہیں تو جانوروں کی یہ قربانی ایک خول اور ڈھانچہ ہے جس میں کوئی روح نہیں۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی!

جانوروں کا ذبح کرنا رہ گیا ہے' اس میں جو روحِ ابراہیمی تھی وہ موجود نہیں ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہم میں سے ہر شخص کو اپنے دل کو ٹٹولنا چاہئے کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔ میری زندگی سنّتِ ابراہیمی کے مطابق ہے یا نہیں!! اگر ہے تو جانوروں کی قربانی کی بھی ہماری زندگی کے ساتھ ایک مطابقت ہے۔ اگر نہیں ہے تو یہ ایسا ہی ہے کہ نیم کے درخت پر ثمر بہشت کا ایک آم لا کر ہم نے دھاگے سے باندھ دیا ہے۔ اللہ

اللہ خیر سلاّ! —— اس سے وہ درخت آم کا نہیں ہو جائے گا' وہ تو نیم ہی کا درخت ہے اور وہی رہے گا۔ ہماری جو کیفیات بالفعل ہیں وہ تو یہی ہیں کہ ہم نے نیم کے درختوں پر اِدھر اُدھر سے کچھ آم لاکر ٹانک لئے ہیں۔ اور جس طرح ہم نے دین کے دوسرے بہت سے حقائق کو محض رسموں میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے اسی طرح قربانی کی اصل روح بھی ہمارے دلوں سے غائب ہو چکی ہے اور اب اس کی حیثیت بعض کے نزدیک ایک رسم کی ہے اور اکثر کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کر ایک قومی تہوار کی —— یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہر سال پندرہ بیس لاکھ سے بھی زائد کلمہ گو حج کرتے ہیں اور بلا مبالغہ پورے کرۂ ارض پر ہر سال عید الاضحیٰ کے موقع پر کروڑوں جانوروں کی قربانی دی جاتی ہے لیکن وہ روحِ تقویٰ کہیں نظر نہیں آتی جس کی رسائی اللہ تک ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے وہ دل' وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے!

یعنی اللہ کا تقویٰ مسلمانوں میں کم یاب' بلکہ عنقا شے بن کر رہ گیا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ عقل و شعور کے ساتھ ہم میں اس بات کی طلب پیدا ہو' ہم متوجّہ ہوں اور معلوم کریں کہ کُل روحِ دین کیا ہے! روحِ قربانی کیا ہے! جس کا ایک نمونہ اور جس کی ایک یادگار ہم ہر سال جانوروں کی قربانیوں کی شکل میں مناتے ہیں —— اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی اصل حقیقت کا فہم عطا فرمائے اور ہمیں ہمت دے کہ ہم واقعتاً اپنے مفادات' اپنے جذبات' اپنے احساسات اور اپنی محبتیں' ان سب کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پر قربان کر سکیں —— اور ہمیں توفیق دے کہ ہم اصل روحِ قربانی کو اپنی شخصیتوں میں جذب کر سکیں اور عیدِ قربان پر جب اللہ کے نام پر جانور کی قربانی کریں اور اسے ذبح کریں تو ساتھ ہی یہ عزمِ صمیم بھی کر لیں کہ ہم اپنا تن' من' دھن اس کی رضا کے لئے' اس کے دین کی سربلندی کے لئے اس کی راہ میں قربان کر دیں گے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المُسلمین والمُسلمات OO

حج اور عید الاضحیٰ

اور ان کی اصل رُوح

قرآن حکیم کے آئینے میں

اسلام کے پانچ ارکان میں سے اوّلین اور اہم ترین تو بلاشبہ کلمۂ شہادت ہے جو ایمان کے قانونی پہلو یعنی "اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ" کا مظہر ہے' بقیہ چار عبادات مختلف صورتوں پر مشتمل ہیں' یعنی "اِقَامَۃُ الصَّلٰوۃِ" یا فرض نمازوں کی پابندی' "اِیْتَاءُ الزَّکٰوۃِ" یا صدقاتِ واجبہ کی ادائیگی' "صَوْمُ رَمَضَانَ" یا ماہِ رمضان المبارک کے روزے اور "حَجُّ الْبَیْتِ" یا بیت اللہ شریف کا حج!

ان کے مابین ایک دلچسپ تقسیم تو اس اعتبار سے ہے کہ ان میں سے دو ہر مسلمان پر لازم ہیں' خواہ وہ امیر ہو یا غریب' یعنی صلوٰۃ و صَوم' اور دو صرف کھاتے پیتے مسلمانوں پر فرض ہیں' یعنی زکوٰۃ صرف صاحبِ نصاب پر اور حج صرف صاحبِ استطاعت پر —— لیکن ایک دوسری اور نمایاں تر تقسیم اس اعتبار سے ہے کہ ان میں سے دو یعنی صلوٰۃ و زکوٰۃ بقیہ دو کے مقابلے میں قدرے اوّلیت و اَقدمیت کے حامل بھی نظر آتے ہیں اور عظمت و اہمیت کے بھی۔ اس لئے بھی کہ قرآن مجید میں ان کا ذکر حد درجہ تکرار و اصرار کے ساتھ آیا ہے جبکہ حج کا ذکر کُل تین بار آیا ہے اور صوم کا صرف ایک بار' اور اس لئے بھی کہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کا تذکرہ مکّی دور کے آغاز ہی سے شروع ہو جاتا ہے جبکہ صوم و حج کا ذکر صرف مدنی سورتوں میں ملتا ہے۔ مزید برآں بعض ان روایات میں بھی جن میں نبی اکرم ﷺ کی جنگ کے خاتمے کی کم از کم شرائط کا بیان ہے' شہادتین کے ساتھ صرف صلوٰۃ و زکوٰۃ

کا ذکر ملتا ہے، صوم و حج کا نہیں۔ مثلاً حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے جو طویل روایت احمد، بزار، نسائی، ابن ماجہ وغیرہم نے نقل کی ہے اس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ مبارکہ ملتے ہیں کہ :

((اِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَیَشْھَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ، فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِکَ فَقَدِ اعْتَصَمُوْا وَعَصَمُوْا دِمَاءَ ھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ اِلَّا بِحَقِّھَا ، وَحِسَابُھُمْ عَلَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ)) (۱)

"مجھے حکم ہوا ہے کہ جنگ جاری رکھوں یہاں تک کہ لوگ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ تنہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے بھی ہیں اور رسول بھی۔ جب وہ یہ شرطیں پوری کر دیں تو وہ محفوظ ہو گئے اور انہوں نے اپنی جانیں اور مال بچا لئے، اِلاّ آنکہ کوئی قانونی حق واقع ہو جائے۔ رہا ان (کے خلوص یا عدمِ خلوص) کا حساب تو وہ اللہ کے ذمے ہے"۔

ایسے محسوس ہوتا ہے کہ شان و شوکت اور عظمت و اہمیت کی اسی ظاہری کمی کی تلافی کے لئے اسلام میں دونوں سالانہ تہواروں کو ان دو ارکانِ اسلام کے ساتھ ملحق کر دیا گیا ہے، یعنی عید الفطر رمضان المبارک کے متصلاً بعد اور عید الاضحیٰ حج بیت اللہ کے ساتھ۔

عید الاضحیٰ بلاشبہ حج ہی کی توسیع کی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے کہ حج اس اعتبار سے ایک طرح کی محدودیت کا حامل ہے کہ اس کے تمام مراسم و مناسک ایک متعین علاقے یعنی مکّہ مکرمہ اور اس کے نواح ہی میں ادا کئے جاتے ہیں۔ اسی لئے اس

---

(۱) یاد ہو گا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ہی الفاظ سے استدلال کیا تھا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ سے جنگ کے معاملے میں۔

کے ایک رکن یعنی اللہ کے نام پر جانوروں کی قربانی کو وسعت دے دی گئی ہے، تاکہ اس میں روئے زمین پر بسنے والا ہر مسلمان شریک ہو جائے۔ اور یہی عید الاضحیٰ کی اصل حکمت ہے۔

سب جانتے ہیں کہ حج اور عید الاضحیٰ دونوں حضرت ابراہیم علیہ الصّلوٰۃ والسلام کی شخصیت ہی کے گرد گھومتے ہیں جن کی تعظیم و تکریم روئے زمین کے بسنے والوں کی دو تہائی تعداد کرتی ہے اور ان دونوں کے مراسم و مناسک ان کی حیاتِ طیّبہ کے بعض واقعات کی یادگار ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے طویل سفرِ حیات کا خلاصہ اور لُبِّ لباب اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ ہے : "امتحان و آزمائش" جس کے لئے قرآن حکیم کی اپنی جامع اصطلاح "ابتلاء" ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ میں ان کی پوری داستانِ حیات کو ان چند الفاظ میں سمو دیا گیا ہے :

﴿ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمَاتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ﴾ (البقرۃ : ۱۲۴)

"اور جب آزمایا ابراہیم (علیہ السلام) کو اس کے رب نے بہت سی باتوں میں تو اس نے ان سب کو پورا کر دکھایا"۔

واضح رہے کہ قرآن حکیم میں انسان کی حیاتِ دنیوی کی اصل غرض و غایت ہی ابتلاء و آزمائش بیان کی گئی ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی :

① ﴿ اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ (الملک : ۲)

"وہ جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو کہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے تم میں سب سے اچھا عمل کے اعتبار سے"۔

② ﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ ﴾ (الدھر : ۲)

"ہم نے پیدا کیا انسان کو ملے جلے نطفے سے آزمانے کو، لہٰذا بنایا ہم نے اسے سننے والا، دیکھنے والا"۔

بقول علامہ اقبال ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اور انسان کی فلاح و کامیابی کا دار و مدار اس پر ہے کہ وہ اپنے خالقِ حقیقی اور پروردگارِ حقیقی کی معرفت حاصل کرے اور اس کی محبت سے سرشار ہو جائے' جو گویا امتحان ہے اس کی عقل و خرد کا اور آزمائش ہے اس کے قلبِ سلیم اور فطرتِ سلیمہ کی —— اور پھر پورے عزم و استقلال اور صبر و ثبات کے ساتھ قائم و مستقیم رہے اس کی اطاعتِ کُلی اور فرماں برداریٔ کامل [1] پر جو گویا امتحان ہے اس کے عزم اور حوصلے کا اور آزمائش ہے اس کی سیرت کی پختگی اور کردار کی مضبوطی کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی سب سے پہلے اسی عقلِ سلیم اور فطرتِ سلیمہ کے امتحان سے سابقہ پیش آیا۔ انہوں نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جس میں ہر طرف کفر اور شرک کے گھٹاٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے' اور کہیں بُتوں اور مورتیوں کی پوجا ہو رہی تھی تو کہیں ستاروں اور سیاروں کو پوجا جا رہا تھا' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک مطلق العنان بادشاہ بھی خدائی حقوق (Divine Rights) اور کُلی اختیارات کے دعوؤں کے ساتھ کوسِ لِمَنِ الْمُلْكُ بجا رہا تھا۔ گویا شرکِ اعتقادی اور شرکِ عملی دونوں کے دَل بادل ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کی شان کے ساتھ چھائے ہوئے تھے اور توحید کی کوئی کرن کہیں نظر نہ آتی تھی۔ اس ماحول میں آنکھ کھولنے اور پرورش پانے والے نوجوان نے جب یہ نعرہ لگایا کہ :

---

(۱) یہی وجہ ہے کہ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۳۱ میں حضرت ابراہیمؑ کے کُل کارنامۂ حیات کا خلاصہ بیان کیا گیا لفظ "اسلام" کے ذریعے جس کے معنی ہی حوالگی کامل اور سپردگی کُلی کے ہیں۔

﴿ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾

"جب کہا اس کے رب نے اس سے "حکم مان" فوراً کہا اس نے "میں نے مانا حکم تمام جہانوں کے پروردگارِ حقیقی کا"۔

﴿ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝ ﴾ (الانعام : ۷۹)

"میں نے تو اپنا رُخ پھیر دیا اُس ذات کی طرف جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو' ہر طرف سے یکسو ہو کر' اور میں ہرگز اس کے ساتھ شرک کرنے والا نہیں"۔

توکیا آسمان اور زمین وجد میں نہ آگئے ہوں گے اور کون و مکان میں ہلچل نہ مچ گئی ہو گی! بقول علامہ اقبال ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے!

اور کیا ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ﴾ کی اس شہادتِ عظمیٰ پر ملأِ اَعلٰی کی بزمِ "لامکاں" میں "میرِ محفل"[1] نے ایک بار پھر فتح مندانہ انداز میں نہ کہا ہو گا کہ ﴿ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾

اسی کو تعبیر فرمایا گیا سورۃ الصّٰفّٰت میں ان الفاظ میں کہ :

﴿ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ﴾ (الصّٰفّٰت : ۸۴)

"جب آیا وہ[2] (ابراہیمؑ) اپنے رب کے پاس ایک قلبِ سلیم کے ساتھ"۔

عقل و فطرت کی اس آزمائش اور معرفتِ رب کے اس امتحان میں کامیابی کے فوراً بعد شروع ہو گیا "استقامت"[3] کی جانچ پرکھ کا ایک طویل اور جاں گسل سلسلہ' جس میں ہر لحظہ امتحان تھا' ہر آن ابتلاء۔ ایک جانب ایک نوجوان تھا اور دوسری جانب پوری سوسائٹی اور پورا نظام۔ گویا "کشاکشِ خس و دریا" کا دیدنی نظارہ! عزم و ہمت کا وہ کون سا امتحان تھا جو اسے پیش نہ آیا! صبر و ثبات کی وہ کون سی

---

(۱) خدا خود میر محفل بود اندر لامکاں خسرو — محمدؐ شمع محفل بود' شب جائیکہ من بودم!

(۲) کیا یہ صوفیاء کی اصطلاح "سیر الی اللہ" کا قرآنی ماخذ نہیں ہے؟

(۳) ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ... ﴾ (حٰمٓ السجدۃ : ۳۰)

آزمائش تھی جس سے وہ دوچار نہ ہوا! حوصلۂ تحمل و برداشت اور جذبۂ ایثار و قربانی کی جانچ پرکھ کا وہ کون سا طریقہ تھا جو اس پر آزمایا نہ گیا! گھر سے وہ نکالا گیا، معبد میں اس پر دست درازی ہوئی، سرِعام اس پر ہجوم کیا گیا، دربار میں اس کی پیشی ہوئی اور آگ میں وہ ڈال گیا۔ بقول شاعر ؎

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری   تنہا پس زنداں کبھی رسوا سر بازار!
کڑکے ہیں بہت شیخ سر گوشۂ منبر   گرجے ہیں بہت اہل حکم بر سر دربار

لیکن نہ کبھی اس کے جوش اور ولولے میں کوئی کمی پیدا ہوئی نہ پائے ثبات میں کوئی لغزش! باپ سے "وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا" کی غیظ آمیز جھڑکی کھا کر بھی وہ پورے ادب واحترام اور پورے حلم و وقار کے ساتھ یہ کہتا ہوا رخصت ہوا :

﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِيًّا○ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ ۡ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِيًّا○ ﴾ (مریم : ۴۷، ۴۸)

"تم پر سلامتی ہو! میں اپنے پروردگار سے تمہارے لئے معافی کی درخواست کروں گا، حقیقتاً وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے۔ اور میں اعلانِ براءت کرتا ہوں تم سب سے بھی اور ان سے بھی جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، اور میں تو پکاروں گا صرف اپنے پروردگار ہی کو ـــــ مجھے یقین ہے کہ میں اس کو پکار کر بے نصیب نہ رہوں گا!"

دربار میں پیشی ہوئی تو ؎

نہ لا وسواس دل میں جو ہیں تیرے دیکھنے والے
سرِ مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی!

کے مصداق خدائے واحد و قہار کے پرستار نے دنیوی شان و شوکت، جاہ و جلال اور دبدبے اور طنطنے کو ذرہ بھر بھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے شہنشاہِ وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعلان کیا :

﴿ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ﴾ (البقرۃ : ۲۵۸)

"میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے"۔

اور جب ربوبیت والوہیت کے مدّعی مغرور نے مناظرانہ رنگ میں کہا :

﴿ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ﴾

"مجھے بھی زندہ رکھنے یا مار دینے کا اختیار حاصل ہے"۔

تو پوری جرأتِ رندانہ اور شانِ بے باکانہ کے ساتھ ترکی بہ ترکی جواب دیا :

﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ﴾ (البقرۃ : ۲۵۸)

"تو اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے' (تجھ میں کچھ الوہیت ہے) تو تُو اسے مغرب سے طلوع کر کے دکھا"۔

نتیجتاً اس کافرِ مردود مستی نمرود کے پلے سوائے مرعوبی و مبہوتی کے اور کچھ نہ رہا۔

اور پھر جب پوری قوم' پوری سوسائٹی اور پورے نظامِ باطل نے اپنی شکست پر جھنجھلا کر اسے آگ کے ایک بڑے الاؤ میں ڈالنے اور جلا کر راکھ کر دینے کا فیصلہ کیا تب بھی اس کے عزم اور ارادے میں کوئی تزلزل نہ آیا' اور عشق کی اس بلند پروازی پر وہ عقل بھی انگشت بدنداں رہ گئی جس نے ابتداءً اسے خود ہی اس راہ پر ڈالا تھا ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی!

اور جب خدائے علیم و قدیر نے اُسے آگ سے معجزانہ طور پر زندہ و سلامت نکال لیا تو اس نے یہ کہتے ہوئے کہ :

﴿ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ۝ ﴾ (الصّٰفّٰت : ۹۹)

"میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں' یقیناً وہ مجھے راہ یاب کرے گا"۔

گھر بار اور ملک و وطن سب کو خیرباد کہا اور آباء و اجداد کی سرزمین کو باحسرت و یاس دیکھتا ہوا وہ اَن دیکھی منزل کی جانب روانہ ہو گیا' تاکہ صرف خدائے واحد کی

پرستش کر سکے اور محض اسی کے نام کا کلمہ پڑھ سکے! حالانکہ اب زندگی کے اس دور کا آغاز ہو چکا تھا جس میں جوانی کا زور ٹوٹتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے اور کہولت کے آثار شروع ہو جاتے ہیں! بقول حالی ؎

ضعفِ پیری بڑھ گیا، جوشِ جوانی گھٹ گیا
اب عصا بنوایئے نخلِ تمنّا کاٹ کر!!

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے بعد کی پوری زندگی مسلسل مسافرت و مہاجرت کی داستان ہے۔ آج شام میں ہیں تو کل مصر میں، پرسوں شرقِ اردن میں ہیں تو اگلے روز حجاز میں، کوئی فکر ہے تو صرف اس کی اور دھن ہے تو محض یہ کہ توحید کا کلمہ سربلند ہو اور دعوتِ توحید کے جابجا مراکز قائم ہو جائیں۔ اپنی ان کوششوں میں وہ اس بوڑھے باغبان سے نہایت گہری مشابہت رکھتے ہیں جو جابجا اپنے لئے نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے باغ لگاتا پھر رہا ہو۔

جب بڑھاپے کے آثار کچھ زیادہ ہی طاری ہوتے محسوس ہوئے اور اِدھر یہ نظر آیا کہ اولاد سے تاحال محرومی ہے، تو فکر دامن گیر ہوئی کہ میرے بعد اس مشن کو کون سنبھالے گا۔ وطن سے ایک بھتیجے نے ان کے ساتھ ہی ہجرت کی تھی جسے شرقِ اردن میں دعوتِ توحید کی علم برداری سونپ دی تھی۔ اللہ سے دعا کی ﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ ﴾ (الصّٰفّٰت : ۱۰۰) "پروردگار! نیک وارث عطا فرما!"۔ اور اللہ کی شان کہ خالص معجزانہ طور پر ستاسی برس کی عمر میں اللہ نے ایک چاند سا بیٹا عطا فرمادیا، اور وہ بھی ایسا جسے خود اللہ نے "غُلٰمٌ حَلِيْمٌ" قرار دیا۔

جیسے جیسے بیٹا بڑا ہوتا گیا گویا بوڑھے باپ کا نخلِ تمنّا دوبارہ ہرا ہوتا گیا۔ یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ کیسی جذباتی وابستگی بوڑھے باپ کو اس بیٹے سے ہوگی اور کیسی امیدیں اس نے اپنے دل میں اس کے ساتھ وابستہ کرلی ہوں گی۔ بیٹا برابر کا ہونے کو آیا تو گویا باپ کا دست و بازو بن گیا اور دونوں نے مل کر توحید کے عظیم ترین مرکز یعنی کعبۃ اللہ کی دیواریں اٹھائیں، جسے قرآن نے "اَلْبَيْتُ الْعَتِيْقُ" بھی قرار دیا اور

"اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ" کا مصداق بھی۔

یہ مقدّس معمارانِ حرم جن جذبات کے ساتھ تعمیر کر رہے تھے ان کی عکاسی قرآن حکیم کی ان آیات میں بتمام و کمال کی گئی ہے :

﴿ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص ﴾ (البقرۃ : ۱۲۷، ۱۲۸)

"اور جب ابراہیم اور اسماعیل (علیہما السلام) بیت اللہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے (تو کہتے جاتے تھے) پروردگار ہمارے! قبول فرما ہم سے (ہماری یہ خدمت)، یقیناً تُو سب کچھ سننے والا بھی ہے اور سب کچھ جاننے والا بھی۔ اور اے رب ہمارے! بنائے رکھ ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار، اور اٹھا ہماری اولاد میں سے ایک فرماں بردار امت"۔

اِدھر بوڑھا باپ اپنے جوان ہوتے ہوئے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر جی رہا تھا اُدھر قدرت مسکرا رہی تھی۔ اس کے ترکش امتحان میں ابھی ایک تیر باقی تھا، دل کو چھید جانے والا اور جگر سے پار ہو جانے والا تیر! گویا ابھی آخری آزمائش باقی تھی، محبّت اور جذبات کی آزمائش، اور ایک امتحان باقی تھا، امیدوں، آرزوؤں اور تمناؤں کا امتحان۔

حکم ہوا اپنے بیٹے کو قربان کر دو۔ زمین پر سکتہ طاری ہو گیا، آسمان لرز اٹھا، لیکن نہ بوڑھے باپ کے پائے ثبات میں کوئی لغزش پیدا ہوئی نہ نوجوان بیٹے کے صبر و تحمل میں کوئی لرزش! دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ بقول سرمدؒ

سرمد گلۂ اختصار می باید کرد یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا سر برضائے دوست می باید داد یا قطع نظر ز یار می باید کرد

یہ دوسری بات ہے کہ عین آخری لمحے پر رحمتِ خداوندی حکمتِ امتحان پر غالب آ گئی اور بوڑھے باپ کی امتحان میں کامیابی کا اعلان کر دیا گیا بغیر اس کے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کا ذبح شدہ لاشہ فی الواقع اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

سورۃ الصّٰفّٰت میں کتنے قلیل الفاظ میں صورتِ حال کی مکمل تصویر کھینچ دی گئی ہے:

﴿ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ○ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ○ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ○ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ○ ﴾

(الصّٰفّٰت : ۱۰۲تا۱۰۶)

"تو جب وہ (بیٹا) اس (باپ) کے ساتھ بھاگ دوڑ کرنے کے قابل ہوا تو اس نے کہا: میرے بچے! مَیں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں' تو تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے جواب دیا: ابا جان! کر گزریئے جو حکم آپ کو مل رہا ہے' آپ ان شاء اللہ مجھے صابر ہی پائیں گے۔ پھر جب دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس نے اسے پیشانی کے بل پچھاڑ دیا تو ہم نے پکارا: اے ابراہیم! (بس کر) تو نے خواب پورا کر دکھایا۔ ہم اسی طرح جزاء دیا کرتے ہیں نیکو کاروں کو۔ یقیناً یہ ایک بہت بڑی آزمائش تھی"۔

گویا جس کا امتحان لیا جا رہا تھا اس نے ہمت نہ ہاری' ممتحن ہی کو بس کرنا پڑی۔ جس نے نہ صرف یہ کہ اُس وقت بیٹے کی جگہ مینڈھے کی قربانی بطورِ فدیہ قبول کر لی بلکہ اس کی یادگار کے طور پر ہمیشہ ہمیش کے لئے قربانی کا سلسلہ جاری فرما دیا۔ بمصداقِ الفاظِ قرآنی:

﴿ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ○ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ○ ﴾

(الصّٰفّٰت : ۱۰۷'۱۰۸)

"اور اس کے بدلے میں دی ہم نے ایک بڑی قربانی۔ اور پکار رکھا ہم نے اس (چلن) پر پچھلوں میں"۔

اور اس امتحان اور آزمائش کی ایک طویل داستان کمال کو پہنچی اور عقل و فطرت کی

سلامتی اور سیرت و کردار کی پختگی کی کٹھن جانچ پرکھ اور جذبات و احساسات کے ایثار اور محبّت کی قربانی کے مشکل امتحانات سے گزر کر اللہ کا ایک بندہ ایک طرف خُلّتِ الٰہی کی خلعت سے سرفراز ہوا اور دوسری طرف امامت النّاس کے منصب پر فائز ہوا۔

﴿ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ○ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ○ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ○ ﴾ (الصّٰفّٰت : ۱۰۹-۱۱۱)

"سلام ہو ابراہیم پر! اسی طرح ہم بدلہ دیا کرتے ہیں نیکو کاروں کو' یقیناً وہ ہمارے صاحب یقین بندوں میں سے تھا"۔

اور بقول علامہ اقبال ؎

چوں می گویم مسلمانم ' بلرزم کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را!

گویا یہ ہے ایک سچے مسلمان کی زندگی کی کامل تصویر اور "ایمانِ حقیقی" کی صحیح تعبیر بقول مولانا محمد علی جوہر ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

سورۃ الحج میں حج کے دو ہی بنیادی ارکان کا ذکر ہے [1] ایک اللہ کے نام پر جانوروں کی قربانی اور دوسرے طواف بیت اللہ' اور ان میں سے بھی زیادہ زور اور تکرار و اصرار قربانی پر ہی ہے۔ بفحوائے آیات مندرجہ ذیل :

① ﴿ وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ○ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِىْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ۙ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ○ ﴾ (الحج : ۲۷-۲۹)

---

(۱) حج کے بقیہ مناسک کا تفصیلی بیان سورۃ البقرہ کی آیت ۱۹۶ تا ۲۰۳ میں ہے۔

"اور صدا لگا لوگوں میں حج کے لئے کہ آئیں تیرے پاس پاپیادہ اور دور دراز سے گہری وادیوں میں سے ہو کر آنے والے دبلے اونٹوں پر' تاکہ حاضر ہوں اپنے منافع کے مقامات پر اور لیں اللہ کا نام معین دنوں میں' ان جانوروں کو ذبح کرتے ہوئے جو ہم نے ان کو دیئے ہیں' پھر کھاؤ ان میں سے خود بھی اور کھلاؤ بیکسوں اور محتاجوں کو بھی' پھر وہ دور کریں اپنا میل کچیل اور پوری کریں اپنی نذریں اور چکر لگائیں ہمارے قدیم گھر کا"۔

② ﴿ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْأَنْعَامِ ﴾ (الحج : ۳۴)

"اور ہر اُمت کے لئے مقرر کر دیا ہے ہم نے قربانی کا سلسلہ' تاکہ لیں نام اللہ کا ان چوپایوں کو ذبح کرتے ہوئے جو عطا کئے ہیں ہم نے ان کو"۔

③ ﴿ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۗ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (الحج : ۳۶)

"اور کعبے کی نذر کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لئے اللہ کے شعائر میں سے ٹھہرایا ہے۔ سو لو نام ان پر اللہ کا ان کو قطار میں کھڑا کر کے' پھر جب گر جائیں وہ کروٹ کے بل تو کھاؤ ان میں سے خود بھی اور کھلاؤ صابروں اور بے قراروں کو بھی! اسی طرح ہم نے دے دیا ہے ان کو تمہارے بس میں تاکہ تم شکر کرو اللہ کا"۔

ان میں سے جہاں تک طوافِ بیت اللہ کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ وہ تو صرف مکّہ مکرمہ ہی میں ادا کیا جا سکتا ہے' البتہ قربانی کو عید الاضحیٰ کی صورت میں روئے زمین کے ان تمام لوگوں کے لئے عام کر دیا گیا جو اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کی راہ اختیار کر کے گویا ابراہیم علیہ السلام ہی کی معنوی ذریت میں شامل ہو گئے ہیں' قطع نظر اس سے کہ ان کا کوئی صُلبی و نسلی تعلق ان سے ہے یا نہیں۔ چنانچہ ایک روایت کی رو

سے، جسے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے امام احمد بن حنبل اور امام ابن ماجہ رحمہما اللہ نے اپنی اپنی مُسند میں نقل کیا ہے، آنحضور ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ "یارسول اللہ! ان قربانیوں کی نوعیت کیا ہے؟" تو جواباً آپؐ نے ارشاد فرمایا: "یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنّت ہے!" —— گویا بھیڑوں، بکریوں، گایوں اور اونٹوں کی قربانی اصلاً علامت کی حیثیت رکھتی ہے اطاعت و فرماں برداری اور تسلیم و انقیاد اور اس پر مداومت اور استقامت کی اس روح کے لئے جو حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری شخصیت میں رچی بسی ہوئی تھی اور ان کی پوری زندگی میں جاری و ساری رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں متذکرہ بالا آیات کے متصلاً بعد ہی متنبہ فرمادیا گیا تھا کہ:

﴿ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ﴾ (الحج: ۳۷)

"اللہ تک نہیں پہنچتا ان قربانیوں کا گوشت یا خون، ہاں اس تک رسائی ہے تمہارے تقویٰ کی"۔

یہ دوسری بات ہے کہ جس طرح ہم نے دین کے دوسرے تمام حقائق کو محض رسموں میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے، جس کا مرثیہ کہا ہے علامہ اقبال نے اس شعر میں کہ ؎

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالیؒ نہ رہی!

اسی طرح قربانی کی روح بھی آج نام نہاد مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت کے عمل ہی سے نہیں وہم و خیال سے بھی غائب ہو چکی ہے۔ اور اب اس کی حیثیت بعض کے نزدیک محض ایک رسم کی ہے اور اکثر کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کر ایک قومی تہوار کی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہر سال پندرہ لاکھ سے بھی زائد کلمہ گو حج کرتے ہیں اور بلا مبالغہ کروڑوں کی تعداد میں جانوروں کی قربانی دی جاتی ہے، لیکن وہ روحِ

تقویٰ کہیں نظر نہیں آتی جس کی رسائی اللہ تک ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے!

کاش کہ ہم جرأت کے ساتھ موجودہ صورتحال کا صحیح تجزیہ کر سکیں اور اصل روحِ قربانی کو اپنی شخصیتوں میں جذب کرنے پر کمر ہمت کس لیں، اور عید قربان پر جب اللہ کے لئے ایک بکرا یا دنبہ ذبح کریں تو ساتھ ہی عزمِ مصمم کر لیں کہ اپنا تن، من، دھن اس کی رضا پر قربان کر دیں گے —— گویا بقول شاعر ؎ "میرا سب کچھ مرے خدا کا ہے" اور بفحوائے الفاظِ قرآنی :

﴿ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ○ ﴾

۞۞۞